نذرِ حقیر و ہدیۂ خلوص ۔ اردو ادب کے قدیمی معاونِ محترم جناب رام بابو جی صاحب سکسینہ
ڈائرکٹر پبلسٹی ریاست ... کی خدمت میں

سیماب اکبرآبادی

13/2/35

کارِ امروز

سیماب

پہلا ایڈیشن سنہ ۱۹۳۴ء ایک ہزار

انتساب

میں اس ہدیۂ ناچیز کو اپنی تمام عقیدت اور کمال محبت کیساتھ
ملک کے معزز ترین فرزند اور ادبِ اُردو کے ممتاز معاون

رائٹ آنریبل ڈاکٹر سر تیج بہادر سپرو

ایم، اے، ایل ایل ڈی، کے سی ایس آئی، پی سی (دام اقبالہٗ)
کے اسم گرامی پر معنون و منسوب کرتا ہوں

سیماب
(اکبرآبادی)

قصر الادب۔ آگرہ
۲۰ اپریل سنہ ۱۹۳۴ء

تعارف

شمارہ	عنوانِ نظم	صفحہ	شمارہ	عنوانِ نظم	صفحہ
۱	کارِ امروز	۲	۱۷	فردوسِ گم شدہ	۳۴
۲	اساسِ فردا	۳	۱۸	آزادی	۳۶
۳	نوائے تجدید	۴	۱۹	میرا وطن	۳۸
۴	شعلۂ احساس	۷	۲۰	منادی	[illegible]
۵	صبحِ محبت	۹	۲۱	صعودِ نیاز (تحت النظم)	۴۳
۶	نزولِ انساں	۱۰	۲۲	کانگریس	۴۴
۷	انسانیت (تحت النظم)	۱۱	۲۳	گاندھی	۴۶
۸	سری کرشن	۱۲	۲۴	عیدِ آزادی کی یاد میں	۴۷
۹	طلوعِ سیاست	۱۴	۲۵	ہولی کی تقریب میں نظم لکھنے کی فرمائش پر	
۱۰	بیسوی صدی بکرمی (تحت النظم)	۱۵		(تحت النظم)	۴۸
۱۱	ایک پیغام، اہلِ عالم کے نام	۱۶	۲۶	انقلابِ روس	۴۹
۱۲	نالۂ ناتمام (تحت النظم)	۱۹	۲۷	اے سرمایہ دار!	۵۴
۱۳	گوتم بدھ	۲۰	۲۸	ہلالِ رمضان اور بسنت	۵۶
۱۴	نشاطِ آغاز و خمارِ انجام	۲۱	۲۹	مشرق سے مغرب کو	۵۸
۱۵	بساطِ سیاست	۲۳	۳۰	آہ (تحت النظم)	۵۹
۱۶	رسولِ کائنات	۳۲	۳۱	گلِ نافرمان	۶۰

(ج)

کار امروز

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

کارِ امروز

اے ربِّ قدیم و کردگارِ امروز (جلّ جلالہٗ)
وے نزہتِ ماضی و بہارِ امروز
دیروز رہینِ منتِ رحمتِ تو
لطف و کرمت ضامنِ کارِ امروز

اے سطوتِ دیروز و وقارِ امروز (صلی اللہ علیہ وسلم)
نورِ فردا و جلوہ دارِ امروز
یک سطرِ مرتّب، عالم از دفترِ تو
مجموعۂ کارِ تُست، کارِ امروز

اساسِ فردا

فارغ منشیں زِ اقتدارِ امروز
مستقبلِ تست در کنارِ امروز
دانی کہ سوادِ دفترِ فردا چیست
یک نقطۂ افزودہ بکارِ امروز
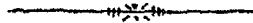
نوائے تجدید

میں کہ، اس ہنگامۂ ہستی میں صرفِ نالہ ہوں
خونچکاں اپنے لبِ فریاد کا تبخالہ ہوں

ماہیت نشو و نمائے دل کی پانی ہو چکی
اب لہو جس سے ٹپکتا ہو وہ شاخِ لالہ ہوں

میری ہر اک جست سے پیدا ہیں لاکھوں بجلیاں
خرمنِ آتش زدہ کا شعلۂ جوالہ ہوں

زندگی کی ڈھونڈتے ہو مجھ میں کیا چنگاریاں
اک حریمِ عیش کی خاکسترِ صد سالہ ہوں

اب وہ صہبائے مسطر جام میں باقی نہیں
مستیٔ تخلیق میرے نام میں باقی نہیں

میں وہ خاکستر ہوں جو ہے پائمالِ انجمن
عبرتِ ماضی ہوں، بربادِ مآلِ انجمن

ہوں تماشہ انقلابِ انجمن کا آج میں
تھا کبھی محوِ تماشائے جمالِ انجمن

ہے مرا انجام اک خوابِ حسیں کا تکملہ
ہے مرا یہ حال تعبیرِ کمالِ انجمن

یادگارِ سطوتِ دیرینہ ہوں بااینہمہ
میری نظروں میں ہے تصویرِ جلالِ انجمن

خستۂ صد عشرتِ دوشینۂ دوراں ہوں میں
گم شدہ افسانۂ عالم کا اک عنواں ہوں میں

میرے نغمے گرمیٔ دنیائے عشرت تھے کبھی
میرے جلوے برقِ سینائے محبت تھے کبھی

اب وہ اک کمزور بھرائی ہوئی آواز ہیں
جو ترانے صورِ بزمِ ملک و ملت تھے کبھی

انحطاط آمیز ہیں جتنے یہ اجزائے شباب
ہے خیال اب تک انہیں ہم بھی غنیمت تھے کبھی

آج جن جذبات پر عائد ہے الزامِ جمود
خلق میں پیغمبرِ تبلیغِ فطرت تھے کبھی

آج جو ناقص ہے کل تکمیلِ موجودات تھا
آج جو نالہ ہے پہلے حاصلِ نغمات تھا

پھر بھی میری خاک میں آواز باقی ہے ابھی
بے پری میں قوتِ پرواز باقی ہے ابھی

عالمِ بالا سے جاری ہیں ابھی سرگوشیاں
خلوتِ الہام کا غماز باقی ہے ابھی

سینکڑوں اسرارِ قدرت میں نے کہہ ڈالے تو کیا
میرے دل میں اک اچھوتا راز باقی ہے ابھی

سننے والا ہو تو پھر نغمہ سرا ہو جاؤں میں
سوزِ فطرت میں مذاقِ ساز باقی ہے ابھی

نغمۂ تازہ مرے ہونٹوں میں پھر بیتاب ہے
پھر مرے تارِ نفس پر بارشِ مضراب ہے

پھر خموشی سے مری پیدا ہے تفسیرِ حیات
خوابِ ہستی میں ہیں پھر آثارِ تعبیرِ حیات

ذرّے ذرّے سے مرے رخشاں ہیں کتنے آفتاب
ہرُبنِ مو سے مرے رقصاں ہے تنویرِ حیات

پھر مری پستی سے ہے ایوانِ رفعت کی نمود
پھر مری ہستی سے ہے تحریکِ تدبیرِ حیات

پھر مری ہر سانس سے اک زندگی بیدار ہے
پھر مجھے منظور ہے تنظیم و تعمیرِ حیات

دَورِ دُنیائے کہن کو مژدۂ تجدید ہے
پردۂ ظلمت سے پیدا مشرقِ امیّد ہے

شعلۂ احساس

بسکہ آزردۂ ویرانیٔ محفل ہوں میں
خرمنِ سوختۂ عیش کا حاصل ہوں میں

غارتِ کیف، رمِ رنگِ چمن، ہجرتِ گل
کس قدر برہمیوں کا متحمّل ہوں میں

انقلاب اور یہ گردش کی غلط سامانی
اپنی منزل ہی پر آوارۂ منزل ہوں میں

منتشر ہیں، مرے اسبابِ تموّج یعنی
مضمحل موجۂ آبِ سرِ ساحل ہوں میں

جس پہ مشکل سے بھی ہوتا نہیں دل کا اطلاق
اپنے پہلو کا وہ برباد شدہ دل ہوں میں

طے بہت جلد ہوئیں عالمِ ظاہر کی حدود
"کاروانم ہمہ بگذشت زمیدانِ شہود"

"مثلِ نقشِ کفِ پا نام ونشانم باقیست"

پھر مری آتشِ جذبات میں طغیانی ہے
سوز کی سرد شراروں میں فراوانی ہے

ازلی مشق ہے مٹ مٹ کے ابھرنا میرا
مانعِ مرگِ ابد میری گراں جانی ہے

پھر مجھے دے کوئی تکلیفِ نواہائے بہار
پھر مجھے اپنی خموشی سے پریشانی ہے

خاکِ گلشن کو سکھانا ہے مذاقِ پرواز
پھر نشیمن پہ مجھے ذوقِ پرافشانی ہے

گو ہے برباد مرا نقشۂ تنظیمِ حیات　　وجد میں پھر بھی مری سوختہ سامانی ہے

پھر نئی پھونک دے پھولوں کی رگوں میں تنویر

جُرعۂ اے فطرتِ افسردہ گلشن برگیر

"آتشِ عشق کہ در شعلہ ستانم باقیست"

زندگی ہستیِ مرحوم پر احساں کردے　　پھر مرتب مرے اجزائے پریشاں کردے

پھر بنا لا مجھے رنگینیٔ دامانِ بہار　　پھر گلستاں میں گل و لالہ بداماں کردے

جمع کر کے مرے سامانِ نواسنجی کو　　بربطِ خامشیٔ عالمِ امکاں کردے

برہمن سے ہو کہ زاہد سے کہیں ربط تو ہو　　قابلِ دیر نہیں ہوں تو مسلماں کردے

بن سکوں میں نہ اگر سروِ چراغانِ حرم　　عُود کی طرح شوالے ہی میں سوزاں کردے

چاہتا ہوں کہ بنوں گرمیٔ رنگِ محفل

"پیکرے باز بروں آر ز خاکسترِ دل"

"قوتِ جنبشِ نو در رگِ جانم باقیست"

صبحِ محبت

وہ بھی کیا محبت کی صبحِ پُرمسرت تھی — حُسن کی فضاؤں میں جب نمودِ جنت تھی
جذبۂ محبت سے تھی بھری ہوئی دُنیا — یہ فلک محبت تھا، یہ زمیں محبت تھی
رات کے حجابوں میں کوندتے تھے سیارے — زلفِ شام سے پیدا صبح کی صباحت تھی
مہر تھا وہی تاباں جو ازل میں چمکا تھا — دلمیں ذرّے ذرّے کے جلوہ گر حقیقت تھی
ہر تبسم اُس کا تھا زندگی کا گہوارہ — ہر ادا تھی اک مژدہ، ہر صدا بشارت تھی
انکھڑیوں کے پیمانے مستیوں کے میخانے — اک نظر محبت تھی، اک نظر صداقت تھی
ٹھوکروں میں پلتی تھی جاہ و حشمتِ عالم — کیا خیال دولت کا، جب نظر ہی دولت تھی
خشت و گل پہ کیا کرتی وہ سرِ جہاں بانی — دل پر اختیار اُس کا۔ روح پر حکومت تھی
جب خفا ہوئیں نظریں، تھا رسن ہر اک تیور — جب جبیں پہ بل آئے، ہر شکن سیاست تھی
اُس کے عہد میں عالم، اک جوانِ رعنا تھا — اُسکے سایے میں دُنیا اک جہانِ عشرت تھی

آہ پھر گئی جب سے وہ نگاہ فطرت کی
یہ قنازدہ دُنیا قبر ہے محبت کی

نزولِ انساں

معمورۂ عالم میں ہر چیز مہیّا تھی
رنگینی و شادابیٔ فردوس تماشا تھی

ضو ریز سمندر میں مہتاب کی کرنیں تھیں
مقدم کی تمنا میں بے تاب فضائیں تھیں

دنیا تو مکمل تھی، انسان نہ تھا کوئی،
محفل تو مرتب تھی سامان نہ تھا کوئی

ہستی کی ہر اک منزل ازبسکہ اچھوتی تھی
جو شان تھی دنیا کی مطلق ملکوتی تھی

پیکر تھا، مگر زندہ آثار نہ تھے اس میں
تھا ساز مگر نغمے بیدار نہ تھے اس میں

اک خواب تھی یہ دنیا، رنگیں بھی معطر بھی
معدوم تھا ناظر بھی خاموش تھا منظر بھی

ناگاہ دھندلکے میں چھٹکے ہوئے تاروں سے
ماہِ شبِ آخر کے محجوب کناروں سے

مائل طرفِ عالم اک حور نظر آئی
ایجاد کے جلووں سے معمور نظر آئی

انسان در آغوش اک فردوس مکاں اتری
افلاک کی رفعت سے بالائے جہاں اتری

ہمراہ مسافر کے کچھ پھول تھے کچھ کلیاں
اک حلۂ فردوسی احرامِ تنِ عریاں

تازہ تھیں ابھی کلیاں اور پھول شگفتا تھے
بہلانے کو انساں کے رنگین سادہو کا تھے

سہما ہوا انساں تھا اندیشۂ غربت سے
ڈالے ہوئے ہاتھ اُسکی گردن میں محبت سے

حال کا اشارہ تھا وہ آئی تری دُنیا
کھول آنکھ کہ ہے یکسر رعنائی تری دُنیا

ہنگامۂ ہستی سے معمور اسے کر دے
لے اپنی تجلّی سے پُر نور اسے کر دے

انسانیت

آہ، اے انساں، تری روحانیت جاتی رہی
وہ فرشتوں کی سی مطلق محویت جاتی رہی

بھر گیا جہل و عناد و کبر سے تیرا دماغ
جو فروغِ ذہن تھی وہ ذہنیت جاتی رہی

کارگاہِ نفس نے روحِ حقیقت چھین لی
بارگاہِ قدس کی قدوسیت جاتی رہی

ماتم اے انساں! کہ تیرے پیکرِ غلطیدہ میں
بربریت رہ گئی انسانیت جاتی رہی

سری کرشن

ہوا طلوع ستاروں کی دلکشی لے کر سرور آنکھ میں، نظروں میں زندگی لے کر
گذشتہ صبح محبت کو ڈھونڈنے نکلا اک آفتابِ محبت کی روشنی لے کر
خودی کے ہوش اُڑانے بصد نیاز آیا نئے پیالوں میں صہبائے بیخودی لے کر
فضائے دہر میں گاتا پھرا وہ پریت کے گیت نشاط خیز و سکوں ریز بانسری لے کر
رہا جمال سے انوار بار مدت تک جبال و دشت میں فطرت کی چاندنی لے کر

جہانِ قلب سراپا گداز بن ہی گیا
ہر ایک ذرّہ محبت کا ساز بن ہی گیا

جمال و حسن کے کافر نکھار سے کھیلا ریاضِ عشق کی رنگیں بہار سے کھیلا
سمجھ کے عالمِ فانی کو ایک بازیچہ کبھی چمن سے کبھی کوہسار سے کھیلا
پھیروں کی کبھی رسم کی ادا اُس نے گوالہ بن کے کبھی سبزہ زار سے کھیلا
بجا کے بانسری، نغموں پر اپنے وجد کیا خود اپنی زندگیٔ پُر وقار سے کھیلا
بنا دیئے کبھی ٹھوکر سے پریم کے چشمے کبھی چمن کبھی گنگا کی دھار سے کھیلا

ہنسی ہنسی میں وہ دُکھ درد جھیلتا ہی رہا
کرشمہ باز زمانے سے کھیلتا ہی رہا

کیا زمانے کو معمور اپنے نغموں سے
سکھائے عشق کے دستور اپنے نغموں سے

صداقت اور محبت کی اُسنے دی تعلیم
اندھیریوں میں بھرا نور اپنے نغموں سے

بنائے طورِ تجلی سے اپنی بن بن میں
دکھایا جلوۂ مستور اپنے نغموں سے

جو روح غم کی تہوں میں کہیں ملی مغموم
اُسے بھی کر دیا مسرور اپنے نغموں سے

لطافتوں سے کیا ارضِ ہند کو لبریز
کثافتوں کو کیا دُور اپنے نغموں سے

فلک کو یاد ہیں اُس عہدِ پاک کی راتیں
وہ بانسری وہ محبت کی سانولی راتیں

دلوں میں رنگِ محبت کو اُستوار کیا
سوادِ ہند کو گیتا سے نغمہ زار کیا

جو راز کوششِ نطق و زباں سے کھل نہ سکا
وہ راز اپنی نگاہوں سے آشکار کیا

نقوش ثبت کئے اپنی رہنمائی کے
زمیں کو فیضِ قدم سے فلک وقار کیا

دیا جو درس زمانے کو بے مثال دیا
کیا جو کام زمانے میں، یادگار کیا

اُداسیوں کو نئی زندگی عطا کر دی
ہر ایک ذرّے کو دل دے کے بے قرار کیا

جو مشرب اُس کا نہ اسطرح عام ہو جاتا
جہاں سے محو محبت کا نام ہو جاتا

طلوعِ سیاست

محفلِ عالم جمالِ حسن سے خالی ہوئی — صبح کی صورت جہنم کی طرح کالی ہوئی
سہم کر تاروں کی خلوت میں محبت چھپ گئی — وہ صداقت اور وفا کی گود کی پالی ہوئی
دیوِ استعمار نخوت سے ہوا گرمِ خرام — ہر قدم پر روحِ آزادی کی پامالی ہوئی
رات بن کر سطحِ عالم پر سیاست چھا گئی — تیرگی کی خلوتوں میں اس کی رکھوالی ہوئی
ساری دنیا کے اجالوں میں اندھیرا چھا گیا — تھی سیہ کاری کی آخر یہ بنا ڈالی ہوئی

حرص کے بندے بڑھے صبر آزمائی کیلئے
اک عذابِ نو ہوا نازل خدائی کیلئے

رسم و آئینِ محبت پر تباہی آ گئی — صبحِ فطرت کی سپیدی میں سیاہی آ گئی
بھول بیٹھا آدمی انجام کارِ زندگی — سرنگونی میں ادائے کج کلاہی آ گئی
ذرۂ ناچیز سورج بن کر اترانے لگا — خاک کے سر میں ہوائے بادشاہی آ گئی

جوشِ نخوت میں سیاست نے کیے ایسے گناہ
تنگ اپنی جان سے خود بے گناہی آ گئی

محفلِ مہر و وفا سے بے خودی رخصت ہوئی
خود نمائی صورتِ قہرِ الٰہی آ گئی

منتقل جو عہدِ شخصیت کی لعنت ہو گیا
نام اُس قانونِ وضعی کا "سیاست" ہو گیا

بیسویں صدی بکرمی

اک دَور وہ تھا، روح فزا، کیفیت اندوز
کعبے میں تھی اک عید تو بتخانے میں نوروز

تھا برہمن و شیخ میں اک ربطِ مسلسل
ناقوس و اذاں کا تھا ہر اک نغمہ دل افروز

اک دَور یہ ہے کعبہ و بتخانہ میں ہے جنگ
حالانکہ وہ منصور ہے اسمیں نہ یہ فیروز

اعمالِ جنوں خیز سے ہیں ہند کی قومیں
پُرشور، غم افروز، شر اندوز، حسد توز

شورش پہ ہے آمادہ شعارِ بت خاموش
ہو جاتا ہے دُنیا میں فساد ایک نیا روز

ہر برگ میں ہر پھول میں چھپی ہوئی سازش
ہر ساز کی آواز میں دہکا ہوا اک سوز

مندر کے مغنّی سے خدارا کوئی کہدے
اے مرغِ سحر ضبط نہ پروانہ بیاموز

کاں سوختہ را جاں شد و آواز نیامد

ایک پیغام

اہلِ عالم کے نام

یاد ہیں وہ دن کہ یہ دُنیا محبت خانہ تھی، بارشِ حُسن و صداقت، نازشِ کاشانہ تھی
ایک آزردہ سی چتون میں بھی تھا حُسنِ کُشاد ایک دزدیدہ نظر بھی گرمیٔ افسانہ تھی
آدمی اپنے ہی کیفِ سرمدی میں مست تھا تشنہ کامی بے نیازِ ساغر و پیمانہ تھی
اپنے استحکام سے فارغ تھا ذہنِ آدمی صَرفِ تعمیرِ جہاں میں ہمتِ مردانہ تھی
"دیوِ استعمار" بننے پر نہ تھا انساں حریص "شخصیت" احساسِ استبداد سے بیگانہ تھی
ریت کے ذرّوں پہ سر جھکتے تھے سجدوں کیلئے بندگی ناآشنائے کعبہ و بتخانہ تھی

گلشنِ ہستی میں یک رنگی کا عالم عام تھا
پہلے صرف اک قوم تھی "انسان" جس کا نام تھا

رفتہ رفتہ سادگی کے پیرہن بدلے گئے کچھ نئے پہلو میانِ انجمن بدلے گئے

آدمیّت کو پسند آیا درندوں کا لباس — فکر کے تیور، نظر کے بانکپن بدلے گئے
خود پرستی نے حکومت کی حدیں تیار کیں — جنگلوں میں انقلاب آیا چمن بدلے گئے
کی گئی تقسیم مقبوضات میں سطحِ زمیں — دہر کے نقشے بہ عنوانِ "وطن" بدلے گئے
جن میں پھولوں کی نزاکت تھی ستاروں کی چمک — سب محبت کے وہ اندازِ کہن بدلے گئے
آگ میں لوہے کو بدلا اور ڈھالے اُس سے تیر — پھر کمانداری سے دلداری کے فن بدلے گئے
سجدہ گاہوں میں تعصب نے نئی تفریق کی — خانقاہوں میں عبادت کے چلن بدلے گئے

جادۂ صدق و وفا پر ظلمتیں طاری ہوئیں
کارواں پر خود روی کی لعنتیں طاری ہوئیں

جنگ و خونریزی نشاطِ عشرتِ عالم ہوئی — بربریت سے رگِ انسانیت محرم ہوئی
کھو گیا انسان ظاہر داریوں کے سیل میں — روح کی قوت بقدرِ مادیت کم ہوئی
نشّہ باقی تھا کہ پیدا ہو گیا کسلِ خمار — سرخوشی کی انتہا میں ابتدائے غم ہوئی
زندگی پر موت کی خاموشیاں چھانے لگیں — دل نوازی ساز کی، نغموں کی لَے مدّہم ہوئی
نالۂ نَے نے لگا دی آگ دشت و کوہ میں — آتشِ گل سے پریشاں محفلِ شبنم ہوئی
آدمی نے کی گوارا خوئے جبر و اختیار — فطرتِ تخلیق کی معصومیت برہم ہوئی
لی تمدن نے نئے قانون و آئیں کی آڑ — نظم کے پردے میں بنیادِ ستم محکم ہوئی

آہ وہ محفل نہ وہ بادہ نہ وہ ساقی رہا
اُسکے ماتم کے لئے "شاعر" کا دل باقی رہا

دینِ فطرت بھی وہ ہی آئینِ فطرت بھی وہ ہی — صبح کی رَو بھی وہ ہی، رفتارِ ظلمت بھی وہ ہی
چاند کی نظروں میں ابتک ہے وہ ہی عالم کُشی — سینۂ خورشید میں سوزِ حقیقت بھی وہ ہی
ہے وہ ہی خاکِ چمن کی ماہیت گُل آفریں — رس وہ ہی غنچوں میں۔ پھولوں میں لطافت بھی وہ ہی
کوہساروں میں وہ ہی ہے ارتفاعِ اوّلیں — خاک اور افلاک کی پستی و رفعت بھی وہ ہی
ہے مذاقِ خواب سبزے کا اُسی انداز پر — جاگنے کی دیدۂ انجم میں قوّت بھی وہ ہی
ہے وہ ہی موجوں میں مستی اور رقصِ آبشار — شمع کا دستور۔ پروانوں کی عادت بھی وہ ہی
گرمیٔ تخلیق میں ابتک وہ ہی ہے سوز و ساز — عشق میں اور حُسن میں رسمِ محبت بھی وہ ہی

کاش یہ تقلید کرتا فطرتِ آزاد کی
زندگی انساں نے اپنے ہاتھ سے برباد کی

ہوشیار اے اہلِ عالم! اب نہیں ہنگامِ خواب — محفلِ ہستی یوں ہی کب تک اسیرِ انقلاب
بربریٔ تہذیب سے، ہنگامۂ تخریب سے — تم نے دُنیا کے ہزاروں دَور کر ڈالے خراب
دُور کر سکتی ہے اک انگڑائی اب بھی روح کی — شخصیت کی تشنگی، جمہوریت کا اضطراب
پھر نظامِ دہر کو پیرایۂ تجدید دو — اپنی دُنیا کو بنا دو بزمِ فطرت کا جواب

قومیت، فرقہ پرستی، اور نسلی امتیاز
پیکرِ انسانیت پر اک طرح کا ہیں عذاب

قلعۂ پندار کو مسمار کردو - توڑ دو
چاک کرکے پھینک دو یہ مادّیت کا حجاب

صرف تم "انسان" بن کر اپنی دُنیا میں رہو
پُرسکوں، آزاد، یکسو، کامگار و کامیاب

بادۂ کبر و خودی ناپاک ہے ملعون ہے
پی رہے ہو تم جسے انسانیت کا خون ہے

نالۂ ناتمام

مجھے محروم اپنی انجمن سے کردیا تونے
بنا کر بوئے گل، رخصت چمن سے کردیا تونے

میں شبنم بن کے صبحِ قدس میں بسنے کے قابل تھا
فنا کیوں مجھ کو سورج کی کرن سے کردیا تونے

پریشاں ہوگیا شیرازۂ امن و سکوں میرا
کہ بیگانہ مجھے اپنے وطن سے کردیا تونے

جو دل آباد تھا تیرے تعلق کی مسرت سے
اُسے برباد اندوہ و محن سے کردیا تونے

مرے پیکر میں خود ہی پھونک دی اک روحِ آزادی
پھر اُسکا سلسلہ دار و رسن سے کردیا تونے

وہ تو وہ کیا سبک پرواز ہوتا اصل کی جانب
جسے رشتہ بپا "گور و کفن" سے کردیا تونے

اگر تکلیفِ فطرت ہے، نوائے بیخودی میری
تو کیوں بیخود مجھے کیفِ کہن سے کردیا تونے؟

گوتم بودھ

حُسن جب، افسردہ پھولوں کی طرح پامال تھا
جب محبت کا غلط دنیا میں استعمال تھا

بے خودی کے نام سے جب دَورِ جامِ بادہ تھا
جب تجلّیِ حقیقت سے ہر اک دل سادہ تھا

نفس تھا جب عیش کو رازِ بقا سمجھے ہوئے
جب ہوس تھی صرف "عورت" کو خدا سمجھے ہوئے

زیست کا اور موت کا ادراک دُنیا کو نہ تھا
ظلم کا احساس جب بے باک دُنیا کو نہ تھا

علم و عرفانِ الٰہی کی شہادت تو نے دی
غور کرنے کی دلِ انساں کو فرصت تو نے دی

بند آنکھیں کر کے اس دُنیا کے مکروہات سے
تو نے حاصل کی ضیائے دل تجلیات سے

دے کے تعلیمِ الوہیت زبانِ کفر میں
تو نے مذہب کی بِنا ڈالی جہانِ کفر میں

برف زاروں کو ترے انفاس نے گرما دیا
تختِ شاہی کو ترے احساس نے ٹھکرا دیا

یاد تیری آج بھی ہندوستاں میں تازہ ہے
چین، جاپان اور تبّت تک ترا آوازہ ہے

روشنی جس کی نہ ہوگی ماند، وہ مشعل ہے تو
سرزمینِ ہند کا "عرفانیٔ اوّل" ہے تو

نشاطِ آغاز و خمارِ انجام

منزلِ کسل و فنا تھی، اک طلسم سکر و خواب
اس لئے انساں کو بھیجا تھا یہاں پا در رکاب

نشۂ ہستی میں یہ بدمست ہو کر رہ گیا
ہوش کی دنیا ہوئی آخر شکارِ انقلاب

انقلاب

انقلاب اے کاروانِ اہلِ عالم انقلاب!

کیا تھی دُنیا، دیکھتے ہی دیکھتے کیا ہو گئی
صبحِ گلشن رفتہ رفتہ شامِ صحرا ہو گئی

عہدِ زرّینِ گذشتہ پر شعاعِ تبصرہ!
ماضیاتِ دورِ عالم پر نگاہِ احتساب!

احتساب

احتساب اے آدم و اے ابنِ آدم احتساب!

میکدہ فطرت کا تھا اک جلوہ گاہِ پُر سرور
ہر روش پر ہو رہی تھی بارشِ نور و ظہور

رنگ پھٹر کا جس نے کیفِ زندگی پر موت کا
روح کو اب تک نہیں اُس بیخودی سے اجتناب

اجتناب

اجتناب اے میکشانِ خوابِ پیہم اجتناب!

نخوت و نفرت کی زنجیروں کو کر دے پاش پاش
توڑ دے زندانِ باطل، شاد باش آزاد باش

پھر "صداقت" سے دلوں کی تیرگی کو دور کر — پھر "محبت" کے مقدس قصر میں ہو باریاب

باریاب

باریاب اے سطوتِ دُنیائے اعظم باریاب!

آہ وہ خلدِ محبت، حُسن کی وہ جلوہ گاہ — وہ بہارِ رنگ و بو، وہ عشرتِ شام و پگاہ

وقف تیرے ہی لئے تھا چاند تاروں کا سکوں — کیوں ہوا محفل سے دُور اپنی کہ اب ہے اضطراب

اضطراب

اضطراب اے قطرۂ طوفانِ شبنم، اضطراب!

مدتیں گذریں اسے انوار میں جھولے ہوئے — آدمی ہے اب نشاطِ اوّلیں بھولے ہوئے

وہ تجلی پھر دکھادے جو دکھائی تھی کبھی — جلوہ آرا منظرِ ہستی میں ہو جا بے حجاب

بے حجاب

بے حجاب اے فطرتِ ہمراز و محرم بے حجاب!

پھر وہی امن و سکوں ہو، پھر وہی کیفِ نشاط — پرتوِ صبحِ ازل ہو شمعِ بزمِ انبساط

اے فضائے عالمِ ہستی بدل دے اپنا رنگ — اے دعائے ارتقائے دہر ہو جا مستجاب

مستجاب

مستجاب اے التجائے جانِ پُرغم مستجاب!

بساطِ سیاست

عہدِ اولیٰ کی سیاست شمعِ خلوت خانہ تھی
انجمن اصلاح اور تہذیب سے بیگانہ تھی
جنگ ہوتی تھی مگر حُسن و محبت کے لئے
لوٹ دیجاتی تھی دُنیا ایک عورت کے لئے
زندگی سے بھی زیادہ تھی ضرورت حُسن کی
حکمرانوں کے دلوں پر تھی حکومت حُسن کی

سکندر،

مست ہو کر اک نئی انگڑائی لی یونان نے
جنگ کی دیوی کو دیں قربانیاں انسان نے
نغمہ پیرا حُسن تھا تلوار کی جھنکار میں
تھا تبسّم حُسن کا بھی خون کی بوچھار میں
حُسن کی تنویر تہذیبِ سیاست ہوگئی
اس بہانے سے سیاست خوبصورت ہوگئی

قیصرِ روم،

روم سے آیا جو اک طوفان رودِ نیل میں
حُسنِ یوسفؑ جاگ اٹھا مصر کی تخئیل میں
شورِ قرنا سے کلیجہ پھٹ گیا اجرام کا
صور سے پیکار کے چونکا جمود اہرام کا
یہہ سیاست کا نیا پیرایۂ تحقیر تھا
حُسن بعدِ فتح بھی ناقابلِ تسخیر تھا

رفتہ رفتہ جذب عشرت میں سیاست ہو گئی
یہ بساط الٹی، نئی دنیا کی حالت ہو گئی

اب نہ مذہب تھا نہ شورِ آذر و اصنام تھا
آدمی تھا اور ہوس، باقی خدا کا نام تھا

پھر بچھی ایوانِ عالم میں سیاست کی بساط
جمع آ کر ہو گئے اربابِ حزم و احتیاط

جس کو بطحا کے مدبّر نے کیا آراستہ
کاروانِ نو کو راس آیا وُہی اک راستہ

شمعِ منزل بن گیا وہ نافِ عالم کا چراغ
جس سے نور اندوز تھا جسمِ سیاست کا دماغ

خالد (رضی اللہ تعالیٰ عنہ)

بڑھ چلا طوفان بن کر قافلہ اسلام کا
زلزلے میں آ گیا ہر قصرِ روم و شام کا

غازیٔ ملت نے دنیا کو ہلا کر رکھ دیا
آسماں پر پائے حریت اُٹھا کر رکھ دیا

بتکدوں میں نعرۂ اللہ اکبر گونج اٹھا
نغمۂ وحدت سے ہر ایوان ہر گھر گونج اُٹھا

صلاح الدینؒ ایوبی

چند صدیوں میں ہزاروں معرکے سر ہو گئے
ٹوٹ کر دیر و کلیسا سب برابر ہو گئے

ہاتھ میں تلوار تڑپی، خون میں جوش آ گیا
بادہ نوشانِ ہوا و کبر کو ہوش آ گیا

جذبِ وحدت ہو گیا طوفانِ موّاجِ صلیب
یعنی کثرت آ گئی خود اپنے مرکز کے قریب

ضَو حقیقت کی فروغِ آدمیّت بن گئی
شمع کی لَو صاف انگشتِ شہادت بن گئی

نپولین،

درس جب مردِ عرب سے لے چکا طفلِ عجم
صحنِ مغرب میں بھی جا پہونچے سیاست کے قدم

عزم سے سرشار نکلے عیش کا مانِ فرانس
چبھ گئی اُن کے دلونمیں نازنیں پلکوں کی پھانس

یثربی آئیں کا تابع جو سر افگن ہو گیا
نام اُس کا محفلِ عالم میں روشن ہو گیا

انور پاشا،

جب سیاست گرمِ غداری ہوئی مذہب کے ساتھ
روکنے اُس کو اُٹھا غیرت کا اک مضبوط ہاتھ

آخری ہچکی خلافت نے جو لی پایانِ کار
روح اُس کی ہو گئی فرطِ الم سے سوگوار

مردِ بیمار ایک تخیلِ گراں میں کھو گیا
موت یہ سمجھی مرا ٹرکی پہ قبضہ ہو گیا

مصطفیٰ کمال پاشا،

آخر اُٹھا اس عزا خانے سے اک عیسیٰ نفس
ہر نظر جس کی درا، ہر سانس جس کی اک جرس

تھا سیاسیاتِ مغرب میں اُسے حاصل کمال
آ گیا اُس کی سمجھ میں جلد درمانِ زوال

اُس نے ثابت کر دیا یہ سب فریب کار ہے
ترک ابھی زندہ ہے ترکی قوم ابھی بیدار ہے

مہاتما تلک،

ہند جو تھا عظمتوں کی اک گذرگاہِ قدیم
امتدادِ وقت سے تھا حال اُس کا بھی سقیم

"کرشن" کی جس سرزمیں سے کی گئی صورت گری
خاکِ گوتم کی امانت سے جسے تھی برتری

پرچمِ اسلام صدیوں جس پہ لہراتا رہا   آسماں جس کی بلندی کی قسم کھاتا رہا
اب وہ ہی اس دور میں پامالِ استبداد تھی   رہنِ استعمار اُس کی فطرتِ آزاد تھی
آخر اک اللہ کے بندے کو جوش آ ہی گیا   نقشِ قشقہ بر جبیں، گیسو بدوش آ ہی گیا
شمعِ نو سے صحنِ بُت خانہ تجلّی کوش تھا   خانقاہوں کا چراغ اب بھی مگر خاموش تھا

سی آر داس،

اک نیا احساسِ آزادی فضا میں جاگ اُٹھا   سحر بنگالہ بنارس کی گپھا میں جاگ اُٹھا
کاشی و متھرا کی قوموں میں حرارت آگئی   جانبِ منزل رواں ہونے کی قوت آگئی
اپنی آزادی کے چرچے جا بجا ہونے لگے   ملک کی وسعت میں پیدا رہنما ہونے لگے
مسلمِ ہندی اسیرِ خوابِ غفلت تھا ہنوز   اس کی آنکھوں میں وہ ہی کیفِ حکومت تھا ہنوز

لینن،

بزمِ عالم میں سیاست کے یہ طوفاں دیکھ کر   تھی محبت نالہ برلب رنگِ انساں دیکھ کر
جذبۂ اُلفت سے تھا نا آشنا سرمایہ دار   تھا مساوات اور ہمدردی سے خالی روزگار
شخصیت کے بُت، نئے فرعون اور قارون تھے   جس قدر قانون تھے مردود تھے ملعون تھے
وہ مشینیں جن سے کھنچتا تھا غریبوں کا لہو!   وہ جہنم، جن کو اپنے دھن کی تھی ہر دم جستجو!
وہ غلط پندار آقا جن کا تھا دستورِ عام   ساری دُنیا کو بنالیں، اپنی خواہش کا غلام!

سرزمینِ روس سے آخر وہ دِل پیدا ہوا
جس میں دردِ انسانیت کا مستقل پیدا ہوا

اُس نے پھونکا محشرِ عالم میں صورِ انقلاب
ہوگئی بیدار اک آواز سے دُنیائے خواب

بے کسی کے زرد چہرے پر خوشی کا نور تھا
افسرِ شاہی لباطِ محفلِ مزدور تھا

سعد زاغلول پاشا،

اس نوائے نو سے گونجی سرزمینِ مصر بھی
کہنیوں تک چڑھ کے پہونچی آستینِ مصر بھی

ایک جسمِ حریت، اک پیکرِ ملت نواز
کارواں میں صورتِ یوسفؑ ہوا جلوہ طراز

وہ نہیں آواز اُس کی اب بھی عالم گیر ہے
سعیٔ آزادی اُسی کے خواب کی تعبیر ہے

رضا شاہ پہلوی،

سطوتِ ضحاک و کسریٰ کی دبی چنگاریاں
بزمِ جمشید و فریدوں کی تعیُّش کاریاں

جب غرورِ کجکلاہی میں جواں ہونے لگیں
گرمیاں دوزخ کی، جنت سے عیاں ہونے لگیں

شعلہ ہائے عیش روحِ زندگی کو کھا گئے
سرد آتش ہوگئی آتش کدے تھرّا گئے

حافظ و سعدی کی قبروں سے اُٹھا نالا دھواں
ماتم آگیں، نالہ افشاں، درد بار و نوحہ خواں

رحم آخر آگیا فطرت کو اِن حالات پر
اک سحر تاباں ہوئی غم کی اندھیری رات پر

آتشِ افسردہ سے پھر اک شرر پیدا ہوا
نظم اور اصلاح کا پیغامبر پیدا ہوا

صورتِ ابرِ بہار اس سرزمیں پر چھا گیا
سوختہ سامانیوں میں پھر نیا رنگ آگیا

امان اللہ خاں،

مشرقِ بابر پہ تھیں تاریکیاں چھائی ہوئی — غزنوی کی روح تھی ظلمت سے گھبرائی ہوئی
تھی فضاؤں کو جہالت کی گھٹا گھیرے ہوئے — بربریت تھی سیاست کی فضا گھیرے ہوئے
اس فضا سے ایک مہرِ ضوفشاں پیدا ہوا — گردِ منزل سے امیرِ کارواں پیدا ہوا
روشنیٔ علم و عمل کی دُور تک پیدا ہوئی — کوہساروں سے تمدن کی جھلک پیدا ہوئی
سیرِ ہمراہِ ثریا کر کے آیا شہریار — مغرب و مشرق سے لایا چند گوہر شاہوار
اُن کی تابش سے نگاہِ تنگ بیں گھبرا گئی — نور سے چشمِ قدامت بیں چکا چوند آ گئی
سازشیں جہل و قدامت بیں ہوئیں اُسکے خلاف — کاوشیں ذہنِ سیاست بیں ہوئیں اُسکے خلاف
ملک میں اُس کی نفیرِ عام باقی ہے ہنوز — وہ نہیں ہے۔ لیکن اُسکا کام باقی ہے ہنوز
جب اُفق پر پھر تباہی کی سیاہی چھائے گی — آفتابِ نو بنا کر اُس کو فطرت لائے گی

ڈی ویلرا،

آخر آئرلینڈ بھی گونجا نوائے درد سے — ہو گئی معمور اک دُنیا صدائے درد سے
دل نہ تھا آئینۂ تدبیر سب کے پاس تھا — سب کو اپنی اپنی آزادی کا اب احساس تھا
ایک مُہرے نے جوابِ کجروی کچھ کر دیا — رفتہ رفتہ شاہِ استعمار کو زچ کر دیا

گاندھی،

روحِ آزادی نمو پا کر مجسّم ہو گئی، حُرّیت کی اک اساسِ تازہ محکم ہو گئی
اک مقدس زندگی سی ہند پر چھانے لگی "خامشی" سے دیوتاؤں کی صدا آنے لگی
مادّیت سے نہ جب تکمیلِ آزادی ہوئی قوتوں سے روح کی تدبیر ایجادی ہوئی

محمد علی،

محفلِ مشرق میں چمکا آخر اک خورشیدِ نو ڈال دی بیداریٔ مُسلم کی اک تمہیدِ نو
دردِ سے ملّت کے تھا معمور اس کے دل کا ساز اُس کے ہر آنسو میں تھا اک نغمۂ گرمِ حجاز
وہ قبا بر دوش، دردِ قوم میں ڈوبا ہوا وہ غلامی کے بھنور سے سخت گھبرایا ہوا
جذب گو اُس کو کیا شمعِ کلیسا نے بہت اپنی جانب اُس کو کھینچا رنگِ دنیا نے بہت
پھر بھی اُس کی روح کیفِ خاص سے معمور تھی جان دے کر زندگی لینی اُسے منظور تھی
وہ ابد تک ہو گیا محوِ جمالِ زندگی، موت میں اُس کی نہفتہ تھا کمالِ زندگی
جینے والوں سے وہ بعدِ موت بھی ممتاز ہے ساز میں ہر دل کے اُس کی گرمیٔ آواز ہے

حسرت موہانی،

ایک اس کا ہمنوا اس انجمن میں اور ہے اک فرشتہ آدمی کے پیرہن میں اور ہے
اس کے سینے میں بھی ہے اک خونچکاں داغِ وطن وہ بھی ہے اک طوطیٔ آشفتۂ باغِ وطن
جیل کی تنہائی میں نفس آزمائی اُس نے کی ہم غلاموں کے لئے سعیٔ رہائی اُس نے کی

دل کے ٹکڑے اُس کے لب تک نالہ بنکر آئے ہیں
مدتوں چکّی پر آزادی کے نغمے گائے ہیں

آنکھ میں آنسو ہیں، ہونٹوں پہ حدیثِ راز ہے
اُس کی ہر آواز گویا دُور کی آواز ہے

ڈھونڈتا ہے دل کی خاکستر میں اک حاصل ہنوز
ہے اسیرِ حسرتِ "آزادیٔ کامل"، ہنوز

ظفر علی خاں،

ایک قائد اور اُٹھا خطۂ پنجاب سے
ناخدا پیدا ہوا اقوام کے گرداب سے

بے تکلف بولنے والا ادائے خاص میں
اپنے شہپر تولنے والا فضائے خاص میں

وہ اسیرِ درد، آزادی کی تدبیروں کے ساتھ
عمر آدھی کاٹ دی زنداں میں زنجیروں کے ساتھ

اصفہانی تیغ ہے جس کا قلم، ایسا ادیب
روح و دل پر نصب ہے جسکا علَم، وہ خوش نصیب

وہ دبیرِ ملک، احیائے صحافت جس سے ہے
وہ مدبر، نظم و تہذیبِ سیاست جس سے ہے

دورِ آزادی کی جب تسوید کا وقت آئے گا
نام اُسکا بھی جلی حرفوں میں لکھا جائے گا

جواہر لال نہرو،

تھک گیا راہِ طلب میں چلتے چلتے کارواں
وقت بولا "ہے ابھی تحریکِ آزادی جواں"

شمعِ منزل تھی بقدرِ سوز، پروانہ طلب
تھا ابھی دشتِ جنوں افروز، دیوانہ طلب

کارواں واماندگی سے جب نظر آیا خموش
آ گیا "لبیک" کہہ کر اک جوانِ سرفروش

روحِ آزادی جوانانِ وطن میں پھونک دی
آگ اُس کے سوز نے صحنِ چمن میں پھونک دی

منتظر بیٹھی ہے آزادی کسی کی راہ میں
انتظارِ شاطرِ فطرت ہے بازی گاہ میں

اے نویدِ منتظر ویرانیٔ محفل میں آ
شمعِ منزل بن کے ظلمت خانۂ منزل میں آ

اے امیرِ کارواں، اے دستگیرِ کارواں
اے سکونِ کارواں، ہنگامۂ مشکل میں آ

ہو جہاں سے مصلحت تیری ہمیں آواز دے
شورشِ طوفاں میں آ، یا دامنِ ساحل میں آ

آج تیری سیرگاہوں میں ہے شیطاں باریاب
روح میں تشریف فرما ہو، حریمِ دل میں آ

دور پہنچیں ظلم اور انصاف کی آویزشیں
فیصلہ کرنے کو اس جنگِ حق و باطل میں آ

دے ہمیں مینارِ منزل سے پیامِ صبحِ نو
جلوۂ امید بن، تصویرِ مستقبل میں آ

زد سیاست راہِ ما، از کوششِ بے سودِ ما
در جمالِ خویش بنما منزلِ مقصودِ ما

رسولِ کائنات

مسلط بزمِ عالم پر ہوئی یوں تیرہ سامانی — کہ تھی جگنو سے بھی کمزور سورج کی درخشانی
چمن کے رنگ سے تھا اہتمامِ اخذِ تاریکی — سحر کے نور سے تھا انتظامِ ظلمت افشانی
سیاست کی گھٹا میں کوندتی تھی برقِ خودرائی — حکومت کی ہوا میں مست تھی تخئیلِ انسانی
جسے انسان نے سینچا تھا خونِ گرمِ انساں سے — وہ کھیتی ہر فضا میں کر رہی تھی شعلہ افشانی
شکنجہ جور و استبداد کا تھا اور دُنیا تھی — کہیں فخرِ جہاں داری، کہیں فرِ جہاں بانی
سیاست ہی خدا تھی اور سیاست ہی خدائی تھی — خودی نے محو کر دی تھی خدا فہمی خدا دانی
قدم لات و ہبل کے سجدہ پیرائے قبائل تھے — فجور و فسق سے گونجا ہوا تھا عالمِ فانی

غرور و کبر میں تحلیلِ ہستی ہوتی جاتی تھی
یہ دُنیا صرف شیطانوں کی بستی ہوتی جاتی تھی

مدبر، خاکِ بطحا نے کیا آخر نیا پیدا — سیاست میں بھی جس نے کی محبت کی ادا پیدا
اُدھر باطل کی ظلمت میں حقیقت کی ضیا پوشی — ادھر اس کی تجلی میں، خودی پنہاں خدا پیدا
اصولِ نو پہ قائم کی اساسِ زندگی اُس نے — کمالِ روح سے کر کے مقدس تر فضا پیدا

غلاموں کو دیا دل کھول کر پیغامِ آزادی، کیا احساسِ اعرابی میں رنگِ ارتقا پیدا
عرب سے تا عجم وحدت کا سکّہ کر دیا جاری بنا بتخانے کے ماحول سے، کعبہ کیا پیدا
سیاست کو کیا مذہب کے تابع اپنی قوت سے مذاقِ سجدہ سرافرازیوں میں کر دیا پیدا
تمدّن کو کیا آراستہ تہذیبِ کامل سے تدبّر سے کیا دُنیا و دیں میں واسطا پیدا

ان الہامی مساعی کا بالآخر یہ نتیجا تھا
کہ جو قانونِ فطرت تھا وہی قانونِ دُنیا تھا

سلام اے صبحِ کعبہ، السّلام اے شامِ بتخانہ تو حمکا بزمِ آذر میں بہ اندازِ خلیلانہ
حریمِ پاک تیرا اک بلند ایوان حقیقت کا جہاں جبریلؑ بھی ہے مختصر سا ایک پروانہ
کہیں تو زندگی پیرا ہے اعجازِ لبِ عیسیٰؑ کہیں تو خطبہ فرما، اوجِ طائف پر کلیمانہ
فروغِ آفرینش، تو توں پر تیری قائم ہے کہیں تو شمعِ محفل ہے کہیں تو نورِ کاشانہ
کچھ اس انداز سے جلوہ نمائی تو نے فرمائی بساطِ دہر پر ہے ذرّہ ذرّہ تیرا دیوانہ
یہ دُنیا تیری نظروں میں مثالِ نقطۂ ناقص یہ عالم سامنے تیرے بقدرِ ظرفِ پیمانہ
مجھے معلوم ہے رازِ غلامی اہلِ عالم کا ہے آدابِ سیاست سے ترے ذہن انکا بیگانہ

اگر پیرو ترا پھر عالمِ ایجاد ہو جائے
تو انساں کیا یہ ساری کائنات آزاد ہو جائے

فردوسِ گم شدہ

ایک اندھیری رات میں انساں ہے مصروفِ جنگ
عظمتِ باطل کا بھوکا، تشنۂ کامِ نام و ننگ

کُند تلواریں تکبّر کی نیامِ فکر میں
ترکشِ تخئیل میں کمزور جذبوں کے خدنگ

ہے صدائے دشنہ و نشتر سرودِ ارتقا
موت کی ہر چیخ ہے اس کے لئے آوازِ چنگ

خون کے چھینٹوں کو سمجھا ہے بہارِ گُل فروش
مذبحہ اس کو نظر آتا ہے، موجِ آب و رنگ

جتنے معمورے ہیں، ویرانے ہیں اُن سے بھی سوا
باوجود اِن وسعتوں کے، کائنات اِس پہ ہے تنگ

اتنی ہی مخلوق فطرت اور اگر پیدا کرے
سب سما سکتی ہے اس دنیا میں بے ریب و درنگ

طبقۂ محدودِ انساں، وہ بھی مجبورِ فنا!
سہہ رہا ہے وحشتِ تعمیر میں پاداشِ سنگ

معنیٔ "انسانیت" بھولا ہوا ہے "آدمی"
کارواں در کارواں ہے "قومیت" کا عذرِ لنگ

ہیبت افزا اب ہے دنیا کی وہ روحانی فضا
جو فرشتوں کی نظر تھی، اور حوروں کی اُمنگ

شرم کیوں اس جنگِ مہمل سے اسے آتی نہیں؟
محفلِ فطرت پہ کیوں اس کی نظر جاتی نہیں؟

عالمِ ایجاد اک مجموعۂ اضداد ہے
اختلافِ رنگ و بو سے انجمن آباد ہے

باغ میں لالہ بھی ہے، گُل بھی، سمن بھی، خار بھی
ایک رنگیں خامشی، مُہرِ لبِ فریاد ہے

ضد نہیں آپس میں ان کو، باوجودِ اختلاف
جانتے ہیں سب نظامِ دہر، بے بنیاد ہے

رکھ لئے ہیں نام پھولوں کے ہمیں نے مختلف
فطرتِ گلشن مگر اس قید سے آزاد ہے

ہے مذاقِ متحد، کثرت میں وحدت کا ثبوت
کوئی ظالم ہے نہ کوئی شاکیِ بیداد ہے

ان کے باطن کا کوئی انسان محرم ہی نہیں
آشنائے راز صرف اک بلبلِ ناشاد ہے

نغمۂ بلبل سے ہے رسوائیِ رازِ بہار
یوں اسیرِ کاہشِ اندیشۂ صیاد ہے

گلستاں کا ہر ورق ہے، درسِ بیداری ہنوز
آہ انسانِ تغافل کیش کیوں برباد ہے

حسن تھا، روحِ صداقت تھی، محبت تھی جہاں
مجھ کو وہ "فردوسِ گم گشتہ" ابھی تک یاد ہے

جذبۂ حسن و محبت پھر بڑھانا چاہیے
پھر جہنم زار کو جنت بنانا چاہیے

آزادی

وہ اک حورِ مجسّم، صد بہار و صد چمن در بر
نشاطِ دو جہاں در دل، حیاتِ انجمن در بر

سیاہ و مست لمبے بال پیچ و خم سے بیگانہ
نشیلی انکھڑیاں، لیکن مذاقِ رَم سے بیگانہ

نگاہیں آسماں کی رفعتوں پر جھومنے والی
جبینِ صاف، معراجِ افق کو چومنے والی

خلش گل کی جگر میں، اور دل میں درد لالے کا
اِدھر اک ہاتھ میں مسجد، اُدھر گنبد شوالے کا

زباں پر نغمۂ ناقوس سے تنویر کی موجیں
لبِ خود رنگ پر پھیلی ہوئی تکبیر کی موجیں

ہمالہ کی پری، اور طُور کا اک جلوۂ رعنا
جو اُس کی اک نظر زمزم، تو اسکی اک نظر گنگا

غریبوں اور مزدوروں کے ہنس کر بوسے لینے والی
یتیموں اور بیواؤں کے عُقدے کھولنے والی

مساوات و رواداری کے جذبے پاک چتون میں
وفاداری و دلداری کے نقشے چلبلے پن میں

فضا کی وسعتوں میں اُڑنے والی اک ردا سر پہ
ادائیں تیرنے والی ہواؤں کے سمندر پہ

تعصب اور نفرت کے لہو سے دست و پا رنگیں
وفا کے رنگ سے ہر عشوہ رنگیں، ہر ادا رنگیں

تنفّس میں نجات اُس کے، ترنم میں حیا اُس کے
تکلّم گلستاں اُس کا، جلو میں کائنات اُس کے

سکوں برسا ہوا اُس کے تبسّم سے محبّت کا
شگفتہ تیوروں میں موجزن دریا صداقت کا

شعاعِ حسن لرزاں اُسکے فردوسی اشاروں میں
بہار افروز پھولوں میں، صباحت ریز اداؤں میں

زمین و آسماں اُس کے حریمِ ناز کے آنگن،
مہ و خورشید سے اُس کی بساطِ انجمن روشن

چمن اُس کے، بیاباں اُس کے، کوہ و آبشار اُس کے
سمندر اُس کے، میداں اُس کے، امصار و دیار اُس کے

وہ فطرت سے براہِ راست رشتہ جوڑنے والی،
غلامی اُس کے پائے ناز پر دم توڑنے والی،

وہ شہزادی ہے، میں اُسکی محبت کا بھکاری ہوں
وہ آزادی کی دیوی اور میں اُس کا پجاری ہوں
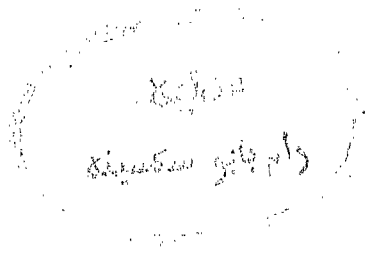
میرا وطن

جہانِ نور بنا ہے، مرے وطن کے اُفق سے | طلوعِ رنگ وضیا ہے، مرے وطن کے اُفق سے
ہے آفتاب کا مولد، سوادِ میرے وطن کا، | بہار جلوہ نما ہے، مرے وطن کے اُفق سے
نظر افق پہ جو پہونچی تو میں نے رات کو دیکھا | کہ چاند جھانک رہا ہے، مرے وطن کے اُفق سے
گھٹائیں جھوم کے آتی ہیں صرف میرے وطن میں | نزولِ آبِ بقا ہے، مرے وطن کے اُفق سے
ہے اک احاطۂ فطرت فصیل میرے وطن کی | فسانہ ریز فضا ہے، مرے وطن کے اُفق سے

یہیں نمودِ سحر ہے، وجودِ شام یہیں ہے
غرض فرائضِ فطرت کا اہتمام یہیں ہے

دمِ سفر مگر اک شعبدہ نیا نظر آیا | نہ آفتاب نہ مہتاب دوسرا نظر آیا
جہاں گیا وہیں فطرت کو ایک رنگ میں دیکھا | وہ ہی سحر وہ ہی انداز شام کا نظر آیا
تجلیاں وہ ہی مشرق میں نورِ مہر کی دیکھیں | وہ ہی افق میں مجھے چاند ڈوبتا نظر آیا
وہ ہی ستارے نظر آئے آسماں پہ فروزاں | وہ ہی گھٹاؤں میں رخشندہ شعلہ سا نظر آیا

بڑھا میں جتنا، بڑھی اتنی ہی یہ محفلِ فطرت　　　جدھر گیا میں اُدھر ہی یہی ماجرا نظر آیا

جو اہتمام کسی اپنی رہگذار میں دیکھا
وہی نظام ہر اک شہر ہر دیار میں دیکھا

کھلا یہ راز، ہیں باطل قیود میرے وطن کی　　　ہیں بے نیازِ تعین حدود میرے وطن کی

جہانِ فکر سے باہر مرے وطن کی حدیں ہیں　　　نہیں اسیرِ نظر ہست و بود میرے وطن کی

سمن سے تا بہ سما ہے مرے وطن کی تجلّی　　　ثریٰ سے تا بہ ثریّا، نمود میرے وطن کی

یہ شش جہات ہیں میرے وطن کا تکیۂ بالیں　　　جبیں ہے عرش پہ صرفِ سجود میرے وطن کی

مشاہدے کے لئے چاہیئے نگاہ میں وسعت　　　بہت وسیع ہے بزمِ شہود میرے وطن کی

زمیں کی سطح سے تا آسمان میرا وطن ہے
یہ فیصلہ ہے کہ "سارا جہان میرا وطن ہے"

منادی

(اسلامیانِ ہند کی جامعِ اعظم کے ماحول میں)

حجاب اُٹھے ہوئے ہیں حُسنِ معنی آشکارا ہے
دیارِ سامری جلوہ نمائے طورِ موسیٰ ہے

اساسِ ارتقا پر ہے جہاں آج آسماں قائم
یہاں وِیرانیاں تھیں دیکھنے والوں نے دیکھا ہے

چمک اُٹھے ہیں وہ ذرّے جو کل تھے گرد میں پنہاں
وہ عالم خواب کا سا تھا یہ بیداری کی دُنیا ہے

نہالِ آرزو کو نخلِ طوبےٰ دیکھنے والو
جسے لائے تھے بہرِ آشیاں ہم، یہ وہ تنکا ہے

طلوعِ لالہ و گُل ہے زمینِ شورۂ فطرت سے
جہانِ زنگ ذرّوں کی رگوں سے پھوٹ نکلا ہے

وہ آنسو جو دُعا کے ساتھ طوفاں خیز نکلا تھا،
وقارِ موجِ گنگا، آبروئے رودِ جمنا ہے

جمودِ قومیت میں جس نے کر دی زندگی پیدا
فنا ہو کر فضائے روح میں اتبک وہ زندہ ہے

ہزاراں کیف مے ریزد ز روحِ خود بجانِ ما
مشیر و سیّد[1] و سالار و میرِ کاروانِ ما

[1] مراد از سیّد علیہ الرحمۃ۔

ترقی کی ہوائیں چل رہی ہیں بزمِ فانی میں
بڑھا ہے عنصرِ باقی مزاجِ زندگانی میں

جنھیں تعمیرِ قومیت میں آتا ہے فنا ہونا
مدارج کچھ انھیں ملتے ہیں عمرِ جاودانی میں

سحر کے بعد بھی عنوان اکثر یاد ہیں ہمکو
بڑی افسردگی تھی آخرِ شب کی کہانی میں

جہالت کی وہ عالمگیر خود رائی و خودداری
سیاست کی وہ دار و گیر سعیِ خوں فشانی میں

نظر آنا وہ ہر منظر میں اک آشوب کا عالم
اُبھر آنا وہ شخصی قوتوں کا حکمرانی میں

وہ سب اغلاطِ شب، پروردۂ جہل و تغافل تھیں
مگر اب آچکی ہے صبح جوشِ ضَوچکانی میں

بُھلا دے کسلِ ماضیات، کیفِ حال پیدا کر
کہ مستقبل ہے تیرا جلوہ گر تیری جوانی میں

برنگ آفتاب از پردہ ہائے ابر بیروں شو
چو قطرہ بگزر از سیلاب دشواری و جیحوں شو

دکھا دے پھر زمانے کو کہ تو اصلاً حجازی ہے
جسے کہتے ہیں غفلت، تیری شانِ بے نیازی ہے

چٹانوں پر ابھی تکبیر کی آواز ہے کندہ
پہاڑ اب تک لرز جاتے ہیں تجھ سے تو وہ غازی ہے

تری ہی فطرت میں ہے قدوسیتِ ذاتِ الٰہی کی
گنہگاری بھی تیری فی الحقیقت پاکبازی ہے

جلالِ شہریاری ہے ابھی تیرے تجمل میں
ابھی تیرے تخیل میں کمالِ فخر رازی ہے

عمل ہے فرض تیرا پھر مآلِ کار جو کچھ ہو
وہ کوئی اور ہے جو ذمہ دارِ کارسازی ہے

کٹھن بھی راہِ جد و جہد میں لیکن کمر بستہ
خیال اتنا رہے تجھ کو کہ ہر قافلہ حجازی ہے

بھلا کر زحمتِ واماندگی پھر مستعد ہو جا　　کہ دنیا دوست بن کر مائلِ غربت نوازی ہے

دریں ہنگامہ شبنم شورِ سازِ محفلے دیگر
پسِ ایں منزلِ پیداست پنہاں منزلے دیگر

رہِ سعی و طلب کی وسعتوں میں رائیگاں ہو جا　　مثالِ سبزہ پھر نیرنگِ صحنِ گلستاں ہو جا
حواسِ خمسہ کو لے ساتھ، اور پھر جادہ پیما ہو　　غبارِ کارواں کب تک، امیرِ کارواں ہو جا
ثبوت اس دور میں دے اپنی فطرت کی بلندی کا　　زمیں گردِ کدورت جب اڑا لے آسماں ہو جا
نگاہِ اہلِ عالم خود ترے جذبات کو پڑھ لے　　جب آئے سامنے کوئی، سراپا داستاں ہو جا
خموشی و سماعت دونوں بہتر ہیں تکلم سے　　چھپا لے راز اپنا، ہو سکے تو رازداں ہو جا
یہ ہیں آدابِ منزل جن سے شاید تو نہ تھا واقف　　سروشِ غیب کی آواز آئی، شادماں ہو جا
شبستانِ منزلِ مقصود کا دیتی ہے پروانہ　　تو یہ پروانہ لے اور شب کے پردے میں نہاں ہو جا

ز منزل آشنا کن قوتِ حسنِ تخیل را
"خدا خود میرِ سامان است اربابِ توکل را"

الٰہی جذبِ کاہیدہ کو ذوقِ بیقراری دے　　شکستِ عزمِ ملت کو بحالِ استواری دے
عمل کی کند رفتاری کو اک بجلی عطا فرما　　دلِ مجبور کو پھر ہمتِ خود اختیاری دے
سوادِ خاطرِ محزوں میں ویرانی جھلکتی ہے　　نہالِ غنچگی کو مژدۂ فصلِ بہاری دے

بہت کمزور ہے نشو و نمائے جسمِ قومیت
ہوائے باغِ ملت کو مذاقِ سازگاری دے

مٹانا ہے تو پہونچا کر مٹا عرشِ ترقی پر
فلک جس کی زمیں ہو وہ عروجِ خاکساری دے

دلِ ناواقفِ انجام گھبرایا ہوا سا ہے
عروسِ آگہی کو اضطرابِ ہمکناری دے

نظامِ ہستیٔ مسلم بدل دے حدِ ممکن تک
قلم کو لوح پر پھر رحمتِ قسمت نگاری دے

چناں در گلشنِ ملت بہارِ اوّلیں آید
ز ہر برگش صدائے شہپرِ روح الامیں آید

صعودِ نیاز

نوائے درد سے معمور ہے مرا آہنگ
تلاش کر نہ مسرت مرے فسانوں میں

شکستِ روح سے جب ٹوٹ جائے سازِ حیات
تو جان آئے کہاں سے شکستہ جانوں میں

قریبِ ختم ہے سوز و گداز کا قصہ
ہے لطفِ آخرِ شب میری داستانوں میں

خرابِ صبح ہیں آثار میری محفل کے
مثالِ کیف ہوں کچھ دم کے میہمانوں میں

یہ مشتِ خاک ہی پھر طالبِ صعود و عروج
الٰہی کوئی زمیں بھی ہے آسمانوں میں؟

مجھے بھی اب تو بنا ایک جرعۂ تخلیق
خمارِ زیست سے میں بھی ہوں سرگرانوں میں

ملا کے خاک میں پھر گل طراز کر مجھ کو
نیاز مند ہوں، شایانِ ناز کر مجھ کو

کانگریس

وہ غمّازِ چمن، افشا کیا رازِ چمن جس نے — وہ اک سازِ چمن، کی گرم آوازِ چمن جس نے
ہ آوازِ چمن، جو پھوٹ نکلی غنچہ و گُل سے — نئے نغموں سے آخر بھر دیا سازِ چمن جس نے
ہ جانبازِ چمن، جس نے صلائے سرفروشی دی — سجا دی خونِ دل سے محفلِ نازِ چمن جس نے
ہ ہمرازِ چمن، جس نے نظامِ نو کیا پیدا — بنائے آشیاں رکھی بہ اندازِ چمن جس نے
ہ دمسازِ چمن، وہ شعلۂ احساسِ آزادی — اسیری میں دکھا دی شانِ پروازِ چمن جس نے
ہ پردازِ چمن، جوہر ہے جو آئینۂ گُل کا — نمایاں کر دیا ہر نقشِ ممتازِ چمن جس نے
اعجازِ چمن، پستی کو جس نے رفعتیں دیدیں — کیا پامال سبزے کو سرافرازِ چمن جس نے

وہ مینائے کہن میں تازگی لائی نئی بھر کر
لگا دی آگ سی، افسردگی میں زندگی بھر کر

ارا اندوزیٔ آئینۂ صبحِ چمن کب تک — گوارا اضطرابِ نسترین و نسترن کب تک
فِ باغباں اہلِ چمن نے ایک سازش کی — کہ ہم تاراج دیکھیں گے یونہی اپنا وطن کب تک
اک شعلہ رائے روحِ گلستاں لوٹنے والو — بنے گا پھول کے دامن سے گلچیں کا کفن کب تک

ہوئی اک مجلسِ شوریٰ مرتب نغمہ سنجوں کی،
کہ آخر ماتمِ بے ربطیِ سازِ کہن کب تک

ستارے اسکے بام و در پر اب بھی جھلملاتے ہیں
مگر یہ آگ برسے گی درونِ انجمن کب تک

اسیرانِ چمن آخر نہ لینگے کب تک انگڑائی
نہ ہوگا دل میں آزادی کا طوفاں موجزن کب تک

یہ جذبہ لیکے نکلے چوڑیاں تھیں جنکے ہاتھوں میں
کہ اب اندیشۂ ہنگامۂ دار و رسن کب تک

کوئی پیغامِ منزل دے امیرِ کارواں بن کر
نہیں تکبیر، تو ناقوس ہی گونجے اذاں بن کر

ہوا اعلان ہر اک شاخ پر سر کی ضرورت ہے
ہر اک برگِ چمن پر دیدۂ تر کی ضرورت ہے

ہے پیمانے میں دل کے بادۂ خونِ جگر کافی
نہ ساقی کی ضرورت ہے نہ ساغر کی ضرورت ہے

وہ پھانسیں جذب کرلیں دل نے جنسے درد بنتا تھا
رگِ جاں کیلئے اک اور نشتر کی ضرورت ہے

سرود و نغمہ سے غفلت کی آنکھیں کھل نہیں سکتیں
ہماری خوابگہ میں صورِ محشر کی ضرورت ہے

اٹھادی جائیں یہ پھولوں کی سیجیں، مخملی تکئے
تڑپنے کے لئے کانٹوں کے بستر کی ضرورت ہے

لبِ خاموش پر اک نالہ ہو دل چیرنے والا
نہ پیکاں کی ضرورت ہے نہ خنجر کی ضرورت ہے

ہمارا ہر نفس ہو ترجمانِ گرمیِ محفل
ہماری ہر ضرورت انجمن بھر کی ضرورت ہے

بڑھے جائیں یوں ہی کہدے کوئی یارانِ محفل سے
صدا "لبیک" کی آنے لگی ہے صبحِ منزل سے

گاندھی

تصرّف ساری دُنیا کے دلوں پر کرلیا تونے
زمانے کو محبت سے مسخّر کرلیا تونے

کیا تحلیل تجھ کو یوں تری فطری لطافت نے
کہ آنکھوں سے گزر کر روح میں گھر کرلیا تونے

تری قدموں پہ ہوتے ہیں نچھاور سینگڑوں ٹکڑے
فسوں کا یا وایسا ڈیڑھ اینچھ کرلیا تونے

حریر و اطلس و دیبا میں اسراف و تکلف تھا
لباسِ خاص اپنا صرف "کھدّر" کرلیا تونے

تمدّن فتح جس کو آجتک کرہی نہ سکتا تھا
وہ قلعہ سادگیِ وضع سے سر کرلیا تونے

تری "جے" ہورہی ہے ہر طرف وہ کامراں تو ہے
ہے جتنا ناتواں اُتنا ہی قسمت کا جواں تو ہے

سمٹنے کو بساطِ عمر ہے، ہنگامہ برپا کر
بڑھا دے گرمیِ محفل، وہ سوزِ تازہ پیدا کر

بدل دے وقت کی آواز سے لَے اپنے نغموں کی
دلوں میں جذبۂ ایثار و حرّیت مہیّا کر

جھلک ناکامیِ امروز کی ہے شامِ محفل میں
انھیں آثار سے پیدا فروغِ صبحِ فردا کر

تجارب اپنی ساری عمر کے صرفِ وطن کردے
مہمّاتِ غلامی میں، جوانوں کو صف آرا کر

نہ دے اپنی عزائم کو خدارا زنگِ مایوسی
جو وعدہ ملک سے تو کرچکا ہے اُس کو پورا کر

نویدِ دورِ آزادی بدہ قیدِ دوامی را
دوپارہ کن ز دستِ خویش زنجیرِ غلامی را

عیدِ آزادی کی یاد میں

آہ پھر غم آفریں ہے رخصتِ ماہِ صیام / عید کا پھر سامنے میرے لئے جاتا ہے نام

پھر مرے احساس کا لیتی ہے دنیا امتحاں / پھر مجھے کرنا پڑا ہے ضبطِ نو کا اہتمام

شدتِ افلاس کا روزوں نے پردہ رکھ لیا / ورنہ اب اس قوم کی قسمت میں ہے صومِ مدام

دل ہے مردہ، چہرہ آزردہ، فسردہ چتونیں / جب یہ حالت ہو تو کیسی عید کس کا اختتام

نوحۂ بیوہ، غمِ مزدور، فریادِ یتیم / عشرتِ رفتہ کا یہ سب لے رہے ہیں انتقام

ہے لباسِ نو بدن پر، باطنِ انساں اُداس / کیا اسی کا نام ہے کامل خوشی، عیشِ تمام

قوم ہے محتاج بھی، مجبور بھی، مغموم بھی، / عید کا آنا ہے برحق، کیا کریں لیکن غلام؟

فرصتِ شادی دریں ہنگامۂ فریاد نیست
نالۂ غم عرضہ کن، وقتِ مبارک باد نیست

وہ حقیقی عید، فطرت جسکی تھی عادی، کہاں؟ / اب وہ اگلی عشرتیں وہ کیفِ آزادی کہاں؟

ہم وہیں ہیں، گرچکے گو طے ہزاروں منزلیں / دیکھئے ہو ختم جاکر دورِ بربادی کہاں؟

دلفگاروں کو نہیں کچھ کام ناؤ نوش سے / مشربِ قیصر کہاں؟ آئینِ سجّادی کہاں؟

عزمِ عشرت بھی کریں گر ہو رہائی کا گماں،
ہم نشیں ہم تو جنم قیدی ہیں، میعادی کہاں؟
ہر نفس اک آفتِ تازہ کا لاتا ہے پیام
خاطرِ ناشاد ماں کو فرصتِ شادی کہاں؟
جس کا ہلکا سا تبسم نورِ صبحِ عید تھا
جلوہ گر آسودگی کی ہے وہ شہزادی کہاں؟
دل غلام، آہیں غلام، آنکھیں غلام، آنسو غلام
ہے غلامی ہی غلامی، آہ آزادی کہاں؟

یاس انگیز است رنگِ شامِ ناشادیِ ما
دور و مستور است صبحِ عیدِ آزادیِ ما

ہولی کی تقریب میں نظم لکھنے کی فرمائش پر

آگ بھی ہے لگی ہوئی، دل میں گداز ہی نہیں
شمعِ حیات کا کوئی سوز نواز ہی نہیں
جاذبِ کیف و نور ہے شدتِ التہابِ روح
رنگ و عبیر سے جبیں لالہ طراز ہی نہیں
اب تو سرِ نیاز ہے اور سجود رائیگاں
ناز کسی پہ کیا کروں، موقعِ ناز ہی نہیں
خلوتِ غم اداس ہے مطربِ خوش نوا کہاں!
نغمہ بھی ہے خفا خفا، سوگ میں ساز ہی نہیں
آہیں سناؤں دل کی بات، چھک گئی حدِ احتیاط
شورشِ تنگنائے دل اب کوئی راز ہی نہیں
آتشِ غم محیط باد از دو جہاں فراغ شد
دل ہمہ شعلہ شعلہ شد، تن ہمہ داغ داغ شد

انقلابِ روس

تصویرِ حیات کے تین رُخ

جب ہستی کے طوفانوں میں اک قطرہ غوطے کھاتا ہے
آہستہ آہستہ آخر جُزوِ طوفاں ہو جاتا ہے

ادبار کے بادل اُٹھتے ہیں، افکار کی فوجیں اُٹھتی ہیں
گردش کے تیز تھپیڑوں سے عبرت کی موجیں اُٹھتی ہیں

یوں زمستانِ عالم میں تکمیلِ حوادث ہوتی ہے
خود نشو و نمائے ہنگامہ، تحلیل کا باعث ہوتی ہے

کہتے ہیں جسے ہستی وہ اک ترکیبِ عروج و پستی ہے
ہر بستی اک ویرانہ ہے - ہر ویرانہ اک بستی ہے

ہر آبادی کچھ ذرّاتِ رخشاں کا اک مجموعہ ہے
ہر کانِ گُہر کچھ قطراتِ نیساں کا اک مرجوعہ ہے

پھولوں کی رگ رگ میں خوشبو، بنتی ہے مٹّی گلشن کی
نیلاہٹ پژمردہ کلیوں کی، رنگینی ہے سوسن کی

دُنیا کے گردش خانے میں سو رنگ بدلنے پڑتے ہیں
انسان کھلونے ہیں کچّے، بنتے ہیں اور بگڑتے ہیں

آغاز پہ سب کی نظریں ہیں، انجام مگر معلوم نہیں
روشن ہے شمع اندھیرے میں، اندازِ سحر معلوم نہیں

سورج تن کر نکلا تھا اپنی کرنوں کی رعنائی میں
آخر جھک کر جانا ہی پڑا تاریکی کی گہرائی میں

نکلا تھا پھول حجابوں سے پریوں کا گھوارہ بن کر
آخر پامالِ گلشن تھا، اک برگِ آوارہ بن کر

جو چاند ابھی لیلےٰ کی طرح محمل سے اُفق کے پیدا تھا
جب صبح ہوئی تو رنگ اُسکا رنگِ مجنوں سے پھیکا تھا

یہ فطرت کی اک عادت ہی جو اُبھرے گا، گر جائے گا
شعلے کی طرح جو لپکے گا، اُس پر پانی پھر جائے گا

وہ روس کا شاہنشاہ جسے دُنیا اک گھر کی جنت تھی

پابوسِ حکومت تھی جس کی، جس کی ٹھوکر میں دولت تھی

انبوہِ علائق میں جس کو یکسوئی پوری حاصل تھی

راحت کے اتنے ساماں تھے، تنظیم بھی جن کی مشکل تھی

تختِ عظمت پر بیٹھا تھا، ماحول کی خوش سامانی میں

سمجھا تھا جزوِ باقی ہوں، میں اس دُنیائے فانی میں

طاعت میں ہزاروں سرخم تھے، لاکھوں سطوت سے ڈرتے تھے

انسان فریبِ شوکت سے جُھک جُھک کر سجدے کرتے تھے

پُرکیف اُس کی اک محفل تھی اور وہ ساقیٔ محفل تھا

دھوکا دیتی تھی ذہنیت گویا انسانِ کامل تھا

آخر گردش کی موجوں میں جب آ پہونچا قطرہ بن کر

ادبار کا اک سیلاب اُٹھا، اور پھیل گیا دریا بن کر

فتنے کی صورت میں منشائے فطرت نے انگڑائی لی

شخصیت پر غالب آ کر، حرّیت نے انگڑائی لی

وہ قصر نشینانِ شاہی، وہ نازوں میں پلنے والے

وہ سطحِ زمیں پر تن تن کر حوروں کی طرح چلنے والے

وہ جن کے گلابی گالوں میں جنت کی جبینیں ڈھلتی تھیں
وہ جن کے پرتو سے برقِ سینا کی شمعیں جلتی تھیں
آخر زندانِ تنگ میں محلوں سے آکر آباد ہوئے
دولت حشمت کچھ ساتھ نہ تھی، ان قیدوں سے آزاد ہوئے
زنجیرِ سیاست پاؤں میں تھی اور بارِ سلاسل ہاتھوں میں
تصویرِ حوادث تھے گویا، سر گردش میں، دل ہاتھوں میں
جن سے عشرت وابستہ تھی وہ سارے رشتے ٹوٹ گئے
وہ قصر وہ ایواں خواب ہوئے۔ دل ٹوٹ گئے جی چھوٹ گئے
وہ زار، وہ سلطانِ رشیا، جو حکمِ زنداں دیتا تھا
خود زنداں کا ایک قیدی تھا۔ خود مجرم تھا قومیت کا
وہ جس کی حرارت سے دنیا بن بن کر برف پگھلتی تھی،
وہ جس کے ایک اشارے پر رشیا کی گاڑی چلتی تھی
اب خود زنداں کی سڑکوں سے وہ برف ہٹاتا پھرتا تھا
تھا زار حقیقی معنوں میں، اُٹھتا تھا اور پھر گرتا تھا
آخر وہ عروجِ شاہانہ، ساتھ اُسکا ہمیشہ دے نہ سکا

لی قوم نے اُس کی جان مگر، بدلہ وہ کسی سے لے نہ سکا

اے نذار یہ تیرا افسانہ، دُنیا کے لئے اک عبرت ہی
یوں گرتے ہیں چڑھنے والے، پستی انجامِ رفعت ہی

اے کاش تو اپنے اس انجامِ غمگیں سے واقف ہوتا
دنیا سے اور دُنیا کے سنگیں آئین سے واقف ہوتا

اے کاش تو دُنیا میں رہکر، دُنیا سے غافل ہو جاتا
عرفان فریب ہستی کا پہلے سے حاصل ہو جاتا

اے زار کے ہمسر اے انساں! لے عبرت اس افسانے سے
تجھ کو بھی یونہی مٹ جانا ہے دنیا کے عبرت خانے سے

وقتی شہرت پر ناز نہ کر، نخوت سے نہ اپنے کام بنا
انجام کی اپنے خیر منا، آغاز کو چھوڑ، انجام بنا

اے سرمایہ دار!

اے مئے پندار سے مخمور۔ اے سرمایہ دار! — اے کہ ہے دولت پرستی تیرا بے مایہ شعار

اے کہ دولت ہی تری دنیا ہے اور دولت ہی دین — اے کہ تو دولت کو ہے سمجھا ہوا پروردگار

زعم میں سرمایہ داری کے یہ وحشت یہ جنوں! — قصۂ مزدور سننا بھی ہے تجھ کو ناگوار

تو کہ سرمائے کی مستی میں ہے سرخوش صبح و شام — تجھ کو کیا معلوم رفتارِ مدارِ روزگار

خود نچوڑی تو نے دولت خون سے مزدور کے — اور پھر غمخواریٔ مزدور بھی ہے تجھ پہ بار

حقِ محنت اس کا دینے میں تجھے سو عذر ہیں — ہیں عرق جس کی جبیں کا تیرے دُرِّ شاہوار

اپنی عشرت گاہ میں تو محوِ خوابِ عیش ہے — اور مزدور اک شکستہ جھونپڑی میں بیقرار

اُس کی بربادی پہ تیرا دل کبھی سوزاں نہیں
وہم ہے تجھ کو کہ تو انساں ہے وہ انساں نہیں!

جانتا ہوں یہ غلط تقسیم ہے تقدیر کی — خواجگی تجھ کو عطا کی اور اُسے بے چارگی

قسمتِ عالم پہ ہے قبضہ مگر اللہ کا — وہ اگر چاہے، بدل ڈالے تری تقدیر بھی

خاک اُڑا دے وہ گھڑی بھر میں خزانوں کی ترے — زرفشاں مزدور کا ہو جائے دامانِ تہی

نعمتِ مقسوم کا ممنون ہونا چاہیئے — صاحبِ دولت کو ہی تحدیثِ دولت لازمی
تیرے سرمائے میں قسمت ہی غریبوں کی شریک — ورنہ کیوں تجھ کو ضرورت سے سوا دولت ملی
وہ بھی اک انسان ہے دنیا میں تیری ہی طرح — بے کس و نادار ہے، لیکن ہے پھر بھی آدمی
خون پانی کرکے وہ بھرتا ہے تیری تھیلیاں — منحصر محنت پر اس کی کامیابی ہے تری

عارضی دولت کے غرّے پر نہ یوں مغرور ہو
سوچ، کیا ہو حال تیرا تو اگر مزدور ہو؟

اپنے ہم جنسوں سے اے منعم نہ وحشت چاہیئے — جن کا تو مخدوم ہے اُنکی بھی خدمت چاہیئے
وہ معاون ہیں ترے، ہمدرد ہیں ہمراز ہیں — حسبِ موقع تجھ کو اُن کی بھی اعانت چاہیئے
حقِ خدمت اُن کا دینا چاہیئے دل کھول کر — جو وفا تجھ سے کریں۔ اُن سے مروّت چاہیئے
دیکھ آنکھیں ان کی ہیں لبریزِ خونِ گرم سے — ان مقدس آنسوؤں کی کچھ تو عزّت چاہیئے
دیکھ محنت سے ہے جسمِ ناتواں انکا فگار — یہ ہیں تیرے دست و پا انکی حفاظت چاہیئے
دیکھ ان کے دل ہیں تیرے ظلم سے ٹوٹے ہوئے — فکرِ دلجوئی بہ اندازِ محبت چاہیئے
دیکھ وہ اک روشنی پھیلی اُفق سے ہوشیار! — اب تو غافل امتیازِ نور و ظلمت چاہیئے

نالۂ مظلوم ہے سازِ انتقام آنے کو ہے
اشتراکیت کا اک طوفانِ عام آنے کو ہے

ہلالِ رمضان

اور

بسنت

ہلالِ ماہِ رمضاں آسماں پر سرنگوں نکلا　　بسنتی پیرہن میں بے قرار و بے سکوں نکلا

اسے ترکوں کے چہرے کیطرح گلرنگ ہونا تھا　　اسے ایرانیوں کی طرح شوخ و شنگ ہونا تھا

بسنت اس کی شعاعِ نور سے رنگین ہو جاتی　　گھڑی بھر کے لئے نظارے کی تسکین ہو جاتی

یہ مغرب سے اٹھا تھا چلبلاپن کیوں نہیں اس میں　　بتانِ مغربی کا رنگ و روغن کیوں نہیں اس میں

اگر بیدار کرتا تھا تقدس ماہِ رمضاں کا　　تو ہوتا ابروئے حورِ ارم انداز عنواں کا

پیامِ صوم دیکر پھر افق میں ہو گیا پنہاں　　چمکتے ہی اندھیرے کے عمق میں ہو گیا پنہاں

ہزاروں سال سے تقاضا ہی یہ بزمِ عالم کا　　زمیں تھی ظلمتِ مطلق، یہ جب بھی بار ہا چمکا

ملوکیت نہ تھی دنیا میں لیکن حکمراں یہ تھا　　نہ تھا کوئی، مگر بامِ فلک سے ضوفشاں یہ تھا

عجم میں روم اور فارس کی دیواروں پہ یہ چمکا　　عرب میں طیبہ و بطحا کے میناروں پہ یہ چمکا

کیا صدیوں تماشائے عراق و مصر و شام اس نے　　گزارا سب سے پہلے سجدۂ بیت الحرام اس نے
پرانا اک مبصر ہے یہی تاریخ عالم کا　　تماشائی رہا ہے جدت و تنسیخ عالم کا
مسلمانوں کا اس نے فرِ عالم گیر دیکھا ہے　　کرشن اور بدھ کا دورِ عظمت و توقیر دیکھا ہے
اسی کے سامنے گذرے ہیں سلجوقی و تاتاری　　اسی کے سایے میں چمکے ہیں عباسی و قاچاری
ہمایوں اور اکبر کا تجمل اس نے دیکھا ہے　　عروجِ روم و یوناں کا تنزل اس نے دیکھا ہے

اس آئینے کا غم آلودگی آئیں نہ تھا پہلے　　یہ ساقیِ تجلی تشنۂ تسکیں نہ تھا پہلے
مگر اس نے مکدر مطلعِ ہندوستاں پایا　　مگر اس نے سوادِ ارضِ کابل بے اماں پایا
نظر ویرانیِ اقوام شاید آگئی اس کو　　یقیناً کربِ عالم کی خلش تڑپا گئی اس کو
یہ شاہد ہے کہ اب دنیا میں خطرے بڑھتے جاتے ہیں　　تباہی کے سمندر اپنی حد سے بڑھتے جاتے ہیں
سمجھتا ہے کہ یہی تھاں صبح و شام کی دنیا　　نہیں اب کام کی دنیا فقط ہے نام کی دنیا
بساطِ عشرتِ ہستی الٹنے پر ہے آمادہ　　ورق رنگینیِ عالم کا ہو جانے کو ہے سادہ

زمیں پر پھول ہی کیا، زرد ماہ آسماں تک ہے
ہے مایوسی کا عالم، وسعتِ عالم جہاں تک ہے

مشرق سے مغرب کو

وطن سے جا رہے ہیں چھوڑ کر رنگیں فزا عالم
نظر میں اک نیا ہنگامہ، دل میں اک نیا ماتم

بہاروں کی یہ آمد، یہ ہماری ناگہاں رخصت
شگفتِ لالہ رنگ و گل، اور اپنا سینہ پُر غم

یہ ہر ذرّے میں اک میخانہ، ہر میخانہ اک مستی
یہ جوشِ رقصِ برگ و گل یہ دُر افشانیٔ شبنم

یہاں کی خاک سے بھی عنبر و اکسیر پیدا ہے
بیابانِ وطن فردوسِ جنت سے نہیں کچھ کم

وطن کا امن، گھر کا عیش، دامن کش سہی لیکن
مرا در منزلِ جاناں چہ امن و عیش چوں ہر دم

جرس فریاد مے دارد کہ بر بندید محملہا

اِدھر فکرِ وطن میں رات دن مغموم جان و دل
اُدھر پُر شور آوازیں "سفر کرنے سے کیا حاصل؟"

اِدھر اپنا تہیّہ "اپنی منزل لے کے دم لیں گے"
اُدھر یہ فیصلہ "تم رہنمائی کے نہیں قابل"

اِدھر دعویٰ ہمارا یہ کہ "ہم حق کے معاون ہیں"
اُدھر بے اعتمادی یہ کہ "ہے ہر ادّعا باطل"

اِدھر درپیش راہ دُور اور اس میں بھی سو خدشے
اُدھر عزمِ سفر پہ مضحکے اور طعنۂ محفل

بھلا ان مشکلوں کا کون کر سکتا ہے اندازہ
شبِ تاریک و بیمِ موج، گردابے چنیں حائل

کجا دانند حالِ ما سبکسارانِ ساحلہا

ہوا ہے ہم سے سرزد کونسا جرمِ شدید آخر؟
محبت کی وہ کیوں کرنے لگے قطع و برید آخر

کہاں اُستادِ مغرب اور کہاں بازی گرِ مشرق
کہیں اُستاد کو پہونچا ہے شاگردِ رشید آخر

کھِچے بیٹھے تھے جو خلوت میں اپنی وضعداری کی
وہ خود کرنے کو آئے صلح کی گفت و شنید آخر

اسی کوشش میں ہم بھی جا رہے ہیں جانبِ مغرب
کہ یہ تاریک راتیں ہوں جوابِ صبحِ عید آخر

تمنّا ہے کہ لوٹیں تو نہ یہ کہنا پڑے ہم کو
ہمہ کارم ز خود کامی بہ ناکامی کشید آخر

نہاں کے ماند آں رازے کزو سازند محفلہا

آ

تسکیں کی طلب ہے تو مناظر کی طرف آ
باطن ترے بس کا نہیں، ظاہر کی طرف آ

گُلہائے محبت کی جو ہے تجھ کو ضرورت
گلخانۂ فطرت کے، مصوّر کی طرف آ

تاچند یہ آشفتگی و تشنہ مزاجی
میخانۂ جمعیّتِ خاطر کی طرف آ

ملتا نہیں تجھ کو جو کہیں امن کا رستہ
آ، منزلِ معنیٰ کے مسافر کی طرف آ

مسجد ہو کہ ہو دیر، حرم ہو کہ کلیسا
سب چھوڑ کے کاشانۂ شاعر کی طرف آ

مشکل وہ ترے ذہن کی آسان کرے گا
"شاعر" تری تسکین کا سامان کرے گا

گُلِ نافرمان

ہندوستان :۔

اب کہاں پہلی سی میرے باغ کی رنگینیاں — غارتِ گلشن ہوئیں بے قاعدہ گلچینیاں
تھیں بہاریں جن سے وہ سنبل شگوفے پژمردہ ہوئے — آتشِ گلشن جو تھے، وہ رنگ افسردہ ہوئے
نسترن ہے اب نہ نسترینِ نہ ریحان و گلاب — لے گئی چن کر خزاں صحنِ چمن کا انتخاب
اب نہ بیلا ہے کہ راتوں میں سحر بانی کرے — اب نہ جوہی ہے کہ روحِ دل کی سیرابی کرے
لالہ و گل ہو گئے رخصت صبا روپوش ہے — رہ گئیں کلیاں تو ان کی انجمن خاموش ہے
ہے مری دنیا میں آج اک انقلاب آیا ہوا — ہر طرف باغوں میں "نافرمان" ہے چھایا ہوا
ہے فضا کی یہ اداہٹ۔ جور کی تکمیل سے — جابجا جسمِ گلستاں پر پڑے ہیں نیل سے
وہ تبسم ریز پھولوں کی صباحت ہی نہیں — رنگ و بوئے باغ میں وہ جاذبیت ہی نہیں
رہ گئیں دل کی طرح گل ریز شاخیں ٹوٹ کر — لے گیا ہے کوئی رنگوں کی جوانی لوٹ کر

اب کہاں وہ امن و تسکیں کی بہار افشانیاں
دورِ "نافرماں" ہے، موجود ہیں نافرمانیاں

نافرمان :-

روکشِ باغِ جناں اے جنتِ ہندوستاں — اے کہ تو ہے سوگوارِ انقلابِ گلستاں
مجھ سے ناحق ہی خفا ہیں خود جفا پروردہ ہوں — دودِ شمعِ سوختہ، سوزِ عزا پروردہ ہوں
آئینہ ہوں ٹوٹنے والوں کے دلِ مایوس کا — ہوں مرقع بیکسوں کی حسرتِ محبوس کا
میں گل و نسرین کے احساسات کا اعلان ہوں — ہوں میں "فرمانِ چمن" کہنے کو نافرمان ہوں
نوحہ خوانِ رنگ و بو، شاکیِ ناشادی ہوں میں — رنگ سے میرے یہ ظاہر ہے کہ فریادی ہوں میں
جوشِ استبداد جب حد سے زیادہ ہو گیا — رنگ اس گلشن کا پانی ہو کے سادہ ہو گیا
باغباں اب بھی اگر شرمندۂ بیداد ہو — پھر اُسی انداز سے صحنِ چمن آباد ہو
پھر وُہی ہو آب و رنگِ نسترین و نسترن — پھر وُہی ہو شامِ سنبل اور صبحِ یاسمن
چھینوں سے پھر بدل جائے اُداسی باغ کی — مشرق نورِ سویدا ہو سیاہی داغ کی

تیرے باغوں میں اگر تسکین کا سامان ہو
کیوں نمودار آج ہر گوشے سے "نافرمان" ہو

امتحانِ شیخ و برہمن

گئے وہ دن کہ حامیٔ باغباں کے تھے گُل و لالہ
اب اسمیں خود نمائی ہے تو اُس میں شانِ خود رائی

خزاں اب کے چمن میں انقلابی بن کے آئی ہے
ہر اک گوشہ میں ہے بیگانگی کی کارفرمائی

تر و تازہ نظر آتا ہے "نافرمان" گلشن میں
اگرچہ ننگِ عبرت ہے طراوت کی پذیرائی

حرم سے بتکدے تک ہر فضا لبریزِ شکوہ ہے
نہیں اب قابلِ برداشت اغماضِ کلیسائی

سرِ افراد میں پیدا ہوئی تمکینِ خود داری
نہ اب وہ آستاں بوسی نہ اب ہے وہ جبیں سائی

کہیں پُر شور ہے ساحل، کہیں ہنگامہ محفل
قیامت بن کے اک شورش ہے دُنیا میں اُتر آئی

وطن کے شیفتہ سرشارِ احساسِ وطن سب ہیں
فدا ہیں ملتِ مرحوم پر، ملت کے شیدائی

نہ ہے خاموش مسلم اور نہ ہندو مائلِ تسکیں
نہ اس میں صبر کی قوت نہ اُس میں ہے شکیبائی

الا اے انقلابِ ملک! یہ وقتِ تدبر ہے
نہ ہو جائے کہیں نقصِ عمل سے تیری رسوائی

الا اے رہبرانِ قوم ہنگامِ تفکر ہے
قدم راہِ ترقی سے نہ ہو مجبورِ پسپائی

ضرورت ہے کہ ہو ہر کام میں اک متحد کوشش
غنیمت ہے جو ہو اس وقت احساسِ گوارائی

روا داری اسی منزل میں شرطِ کامیابی ہے
اسی منزل میں ربطِ باہمی ہے فرضِ یکجائی

سکوں کے ساتھ اپنے جادۂ مقصد پہ جا پہونچو
مزہ جب ہے کہ شورش ہو نہ ہو ہنگامہ آرائی

کہاں فرقہ پرستی اور کہاں سودائے آزادی
یہاں تو "وحدتِ قومی" ہے شرطِ جادہ پیمائی

وفا اک جذبۂ محمود ہے جس میں ہو جتنا ہو،
وفا کا امتحاں دو، ہے اگر دعوائے دانائی

"وفاداری بشرطِ اُستواری اصلِ ایماں ہے"
"نہیں کچھ سبحہ و زنّار کے پھندے میں گیرائی"

"وفاداری میں شیخ و برہمن کی آزمائش ہے"

اتحاد

ہے ربطِ عام بزمِ نسرین و نسترن میں
ذرّوں کی وسعتوں میں، تاروں کی انجمن میں

بیگانگیٔ سبزہ اک رنگ پر ہے قائم
اوراق متحد ہیں پھولوں کے پیرہن میں

یہ لعنتِ تمدُّن، کہتے ہیں جس کو انساں
کیوں اختلاف پیرا، ہے دَورِ پُرفتن میں؟

اب تک نہ اس نے سیکھا باایں ہمہ قدامت
آئینِ دوستداری اس محفلِ کہن میں

درسِ سکوں نوائی بھولا ہوا ہے ہندی
ہے انتشار پیدا شیرازۂ وطن میں

یا رب مذاقِ اُلفت قوموں میں عام کر دے
یا یہ زمیں اُلٹ کر قصہ تمام کر دے

جبرِ باغباں

زندگی اور موت پر زعمِ اختیار

گلشن سے باغباں نے کہا کل شکایتاً ۔۔۔ کیوں میری خدمتوں کا نہیں ہے تجھے خیال؟

میں سینچتا ہوں تجھ کو محبت کے خون سے ۔۔۔ ہیں میری سعی و فکر کا حاصل ترے نہال

گلچیں سے صبح و شام ہیں گلہا زیاں تری ۔۔۔ کثرت سے آشنا ہے تری خلوتِ جمال

شبنم سے کھیلتا ہے دمِ صبح ہولیاں ۔۔۔ تجھ کو صبا کی چھیڑ نہیں وجہِ انفعال

اس جلوہ گاہِ رنگ و نوا کا خدا ہوں میں ۔۔۔ میرے بغیر نظمِ گل و لالہ ہے محال

اے سرزمینِ سُنبل و نسرین و نسترن ۔۔۔ ہے فکر تیری نشو و نما کی مجھے کمال

پروا نہیں مگر مرے احساس کی تجھے ۔۔۔ میں تیری اس ادائے تغافل سے ہوں نڈھال

تنگ آ کے تجھ کو اس لئے دیتا ہوں اطلاع ۔۔۔ میں تیرے اس ستم سے ہوں مجبورِ انتقال

تیرا یہی ہے رنگ تو ہوں طالبِ فنا ۔۔۔ تو جانتا ہے خوب مری موت کا مآل!

پیوست کر دے یا مرے سینے میں نوکِ خار ۔۔۔ یا کر پئے جراحتِ دل سعیِ اندمال

یا مجھ کو اپنے صحن میں جائے مزار دے

گلشن نے دی ندا مرے ہمدرد باغباں ! اک گونہ ہم سے نہیں ہے زیادہ ترا خیال
تیری طرح یہاں بہت آئے چلے گئے فطرت میں بوستاں کی نہ آیا مگر زوال
مرگ اور زیست پر کوئی قدرت نہیں تجھے ہے مرگ و زیست تابع منشائے ذوالجلال
انساں کے اختیار میں ہوتی جو زندگی اٹھتا جہان سے کفن و گور کا سوال
قابو جو اپنی موت پہ ہوتا اسے نصیب سہتا نہ تلخیٔ غم ایام ماہ و سال
یہ جبر و انتداب، یہ تخویفِ خودکشی ! "بے اختیاریوں پہ ہے انسان کا یہ حال"

"کیا جانے کیا کرے جو خدا اختیار دے؟"

تنہائی

کیوں مرے گوشۂ عزلت سے تو گھبراتا ہے اسی اک گوشے میں کونین سما جاتا ہے
سر بہ زانو کبھی خلوت میں اگر ہوتا ہوں پرچمِ فکر مرا عرش پہ لہراتا ہے
ڈھونڈتی پھرتی ہے یہ شورشِ عالم جس کو مجھ سے ملنے اسی تنہائی میں وہ آتا ہے

چشمِ وحدت نگرو جلوۂ یکتائی ہے
لاکھ ہنگاموں سے بہتر مری تنہائی ہے

بلراج کو ہمارا مشورہ

یہاں تو ہر قدم پر چاہیئے اک عالم ایجادی
بہت دشوار ہے اس محبسِ عالم سے آزادی
یہ ذرّے مٹ چکیں تو اک جہانِ نو ہویدا ہو
جسے تعمیر کہتے ہیں وہ ہے انجامِ بربادی
یہ ہنگامے، سکون و امن کی تردید کرتے ہیں
ترقی کا طریقہ چاہیئے سادہ، روش سادی
تلاطم سا بپا ہے قلزمِ تسکیں کی موجوں میں
یہ کیسی امن کوشی ہے کہ خود ہے امن فریادی
رہائی تو بہر صورت مآل کارِ انساں ہے
کہ اس زندانِ ہستی میں ہر ایک قیدی ہی میعادی
ابھی احساس کی بنیاد ہے اک نقش پانی کا

اساسِ سعی ناقص ہو تو یہ ہے نقصِ بنیادی
اگر آئینۂ وطنی کا آئیں مٹ نہیں سکتا
تو ہے مشکل سکھانا صید کو آئینِ صیّادی
فنا خود جذب ہو جائیگی اس شیرازۂ کُن میں
منظّم ہو تو جائے عالمِ فانی کی آبادی
درائے کارواں میں اک توازن کی ضرورت ہے
صدائیں متفق ہوں گی تو گونج اُٹھے گی ہر وادی
موافق ہو فضا، تو شاید اُس کی دید ہو جائے
ابھی سرگشتۂ محمل ہے حرّیت کی شہزادی
لہو کی چند بوندیں چاہئیں عنوانِ افسانہ
کہیں سُرخ اشتہاروں سے ملا کرتی ہے آزادی!

سر از پردہ بروں آر و بخونِ خویش بازی کُن
بر اوراقِ وطن مستانہ حُرّیت طرازی کُن

آزاد و اسیر

آزاد :-

اے اسیرِ فصلِ گُل اے عندلیبِ بیقرار
کیوں قفس میں غمزدہ بیٹھا ہے سر ڈالے ہوئے

آنکھ میں آنسو ہیں، رعشہ ہے بدن پر بار بار
سر خمیدہ کیوں پڑا ہے بال و پر ڈالے ہوئے

تیری آہِ زیرِ لب سے مجھ کو ہوتا ہے یقیں
باغباں کا خوف ہے، صیاد سے ڈرتا ہے تو

ہاں مگر سُن لے کہ جو ڈرتا ہے وہ کامل نہیں
جان پیاری ہے اگر تو عشق کیوں کرتا ہے تو

منزلِ عشق و وفا میں ہمتیں درکار ہیں
اپنی فریاد آزما اپنی فغاں سے کام لے

خامشی بیکار، لب کی جنبشیں درکار ہیں
دامنِ صیاد کیا، صیاد کا دل تھام لے

اک پھریری لے کہ آجائے حمیت جوش میں
رشتہ برپا تابکے، اُٹھ حشر کا سامان کر

جان ڈال آہوں سے، اپنی جرأتِ خاموش میں
ہو ذرا سینہ سپر نالوں کی برچھی تان کر

تجھ کو احساسِ اسیری ہے، تو کچھ تدبیر کر
ایک نعرے سے در و دیوارِ زنداں توڑ دے
اک فغاں دل گیر، اک فریاد عالم گیر کر
ہے یہ ناممکن تو آزادی کی حسرت چھوڑ دے

اسیر:۔

اے مشیرِ نالہ و فریاد اپنی راہ لے
کیوں مجھے کنجِ قفس میں چھیڑنے آیا ہے تو
جان پر اپنی نہ میرا صدمۂ جانکاہ لے
لوٹ جا پیغامِ آزادی اگر لایا ہے تو

درسِ شورش کا خلافِ مشربِ تسلیم ہے
یہ نہیں معلوم اگر تجھ کو تو اب معلوم کر
میری فطرت کو محبت کی یہی تعلیم ہے
شکر کے سجدے کروں ہے لوہے کی کڑیاں چوم کر

نالے کرنا جانتا ہوں واقفِ نالہ ہوں میں
میں کوئی ناآشنائے حرفِ فریاد ہوں؟
میرے دل میں سینکڑوں جذبے ہیں دُنبالہ ہوں میں
کچھ تو سوچا ہے کہ یوں پابستہ اُفتادہ ہوں

گلستاں نزدیک تر ہے خانۂ صیاد سے
ہیں جوانانِ چمن مصروفِ خوابِ ناز میں
میں قیامت کیوں بپا کردوں لبِ فریاد سے
آگ پھولوں میں لگا دوں سوز بھر دوں ساز میں؟

نالہ آساں ہے مگر مشکل ہے ضبطِ آرزو ضبط سے مایوس ہو جاؤں تو پھر نالہ کروں
ضبط اک بجلی ہے خرمن کی ہی جس کو جستجو وقت آ جائے تو گلشن کو تہ و بالا کروں

کاوشوں کی بجلیاں جب شعلہ افشاں ہو گئیں خود بخود رنگِ چمن آتش فگن ہو جائے گا
ضبط کی چنگاریاں جس روز عریاں ہو گئیں یہ قفس بھی خاکِ رنگینِ چمن ہو جائے گا

منتظر منشائے فطرت کا ہوں خاموشی کے ساتھ ہے بڑی آسودگی صبر و رضا میرے لئے
بند ہوں کنجِ قفس میں خود فراموشی کے ساتھ کوئی رستہ کھول ہی دیگا خدا میرے لئے

ہے نگاہوں میں خدا کی موردِ بیدادِ قید کچھ نہ کچھ قسمت کا اسکی فیصلہ ہو جائے گا
زندگی دو دن کی ہے لمبی سہی میعادِ قید آج آیا ہے قفس میں کل رہا ہو جائے گا

بھولے ہوئے فسانے

دُھرا رہی ہے دنیا بھولے ہوئے فسانے — یاد آ رہے ہیں اس کو گذرے ہوئے زمانے

خالی پڑی ہوئی ہیں وہ ڈالیاں چمن میں — آراستہ تھے جن پر رنگین آشیانے

ہو صورِ غزنوی یا تکبیرِ ابنِ قاسمؒ — سب ہیں اسی چمن کے گونجے ہوئے ترانے

شخصیّتوں کی پیہم کچھ آندھیاں چلی تھیں — جتنی ترقیاں تھیں سب لگ گئیں ٹھکانے

یہ قوم اپنی اصلی رفتار چھوڑ بیٹھی — آیا نیا زمانہ رخصت ہوئے پُرانے

اسلاف کے چلن سے اخلاف کو ہوئی ضد — نکلے فروع بن کر کچھ تازہ شاخسانے

تقلیدِ غیر قومی، بد رسمیوں کی کثرت — تہذیب نے سجائے کیا کیا نگار خانے

گذرے ہوئے زمانے اب یاد کر رہے ہو — کس طرح لوٹ آئیں گذرے ہوئے زمانے

ہاں پھر اگر تمہیں ہو احساسِ قوم و مذہب — معمور ہوں دوبارہ غارت شدہ خزانے

صیّاد خود ہی کر دے تم کو رہا قفس سے — خود بجلیاں سجا دیں شاخوں پر آشیانے

باتیں بہت ہیں تم میں لیکن عمل نہیں ہے — تھی یہ بھی ایک نعمت جو چھین لی خدا نے

کمزوریوں کا اپنی ناحق ہے عذر تم کو — کمزوریاں کہاں ہیں۔ یہ ہیں فقط بہانے
ہے ہر عمل میں پنہاں قوت کی ایک تجلی — تیرِ عمل کے خالی جاتے نہیں نشانے
پھر نام سے خدا کے آغازِ کار کر دو — آثارِ نو ہیں پیدا، بدلا ہے رُخ ہوا نے
قدموں پہ پھر تمہارے جھکنے لگے زمانہ — ہوں سجدہ گاہِ عالم ملّت کے آستانے

ثابت کرو کہ تم ہو عالم نواز اب تک
باقی ہے ان رگوں میں خونِ حجاز اب تک

مذہب

مذہب اک رشتہ ہے مابینِ عباد و معبود — نہیں اغراض پرستی کے لئے اس کا وجود
مذہب اک رشتہ ہے جمعیتِ عالم کے لئے — عشرتِ فطرتِ آزاد ہیں مذہب کی قیود
روح کر سکتی ہے محسوس تقدس اس کا — اس کی قوّت ہے شدید اسکا اثر لامحدود
کر دیا جس کی مساعی نے اسے عالمگیر — اُسپہ لاکھوں ہوں سلام اور کروروں ہوں درود
مذہب امن اور تسلّی کا ہے مضبوط حصار — اسکے پیرو پہ ہیں شیطان کی راہیں مسدود
اک یہی مرکزِ رحمت ہے ہر انساں کے لئے — مذہبِ عقل میں ہے منکرِ مذہب مردود

خاطر آزردہ شریکِ انجمن ہوتا ہوں میں — مجھ پہ پروائے روحِ آزادی، تجھے روتا ہوں میں

سینکڑوں تجھ پر سلام اے طائرِ سدرہ نشیں، — تو دمِ پرواز نکلا شہپرِ روح الامیں

عمر بھر آباد رکھا تونے گھر صیاد کا — زیرِ لب تڑپا کیا طوفاں تری فریاد کا

جب فضا تجھ کو بہ اندازِ تکلّم مِل گئی — ایک نالہ تونے وہ کھینچا کہ دُنیا ہِل گئی

تھا قفس میں بھی ہوا خواہِ اسیرانِ وطن — تھی اسیری میں بھی تجھ کو فکرِ درمانِ وطن

رعب سے جن کے زبانیں آجتک خاموش ہیں — چند وہ فقرے ترے اب بھی زیبِ گوش ہیں

زندگی تونے عطا کی ہستیٔ ناکام کو — ہے نویدِ شہرتِ جاوید تیرے نام کو

خوابگہ بھی تیری بیزارِ غلام آباد ہے
جیتے جی آزاد تھا، مرکر بھی تُو آزاد ہے

ہمصفیرانِ چمن کو پھر ہے تیرا انتظار — بے ترے کچھ بے مزہ سا ہے تماشائے بہار

چہچہوں سے اب بھی گو معمور ہے یہ گلستاں — روح کو تڑپانے والے وہ ترے نغمے کہاں؟

یہ وطن تیرا گنہگارِ غلامی ہے ہنوز
سنگِ جادہ کوششوں کی ناتمامی ہے ہنوز

گو جرس پُر شور ہے، چلنے کا ساماں بھی تو ہو
کارواں تیار ہے کوئی حدی خواں بھی تو ہو

دل ہے مطلق برق بننے کے لئے بیتاب پھر
نالہ افشاں ہو رہا ہے دیدۂ بے خواب پھر

ہے اندھیری رات، ساری انجمن خاموش ہے
محفلِ امروز جویائے چراغِ دوش ہے

زندگی کی کشمکش میں دم نہ گھٹ جائے کہیں
تیرگی میں کارواں اپنا نہ لُٹ جائے کہیں

غم گساراں! چارہ سازِ اضطرابِ ما کجاست؟
تیرہ شد ماحولِ مشرق، آفتابِ ما کجاست؟

رہنما

قافلہ آوارہ ہوتا ہے جب اپنی راہ سے
روشنی اک پھوٹتی ہے ہر دلِ آگاہ سے

شوقِ منزل جرأتِ پرواز دیتا ہی انھیں
جو ابھی واقف نہیں ہوتے غمِ جانکاہ سے

خود امیرِ کارواں بنتی ہے گردِ کارواں
سیکھ لیتی ہے حدی خوانی جرس کی آہ سے

ٹوٹتا ہے یہ طلسمِ عارضی انجامِ کار
رہگذارِ ارتقا کی شورشِ ناگاہ سے

مشرقی و مغربی دونوں نہیں ہیں کامیاب
پوچھئے دشواریاں منزل کی خضرِ راہ سے

جاذبِ تنویر پروانے تو لاتعداد ہیں
لو لگی ہے شمعِ منزل کی مگر اللہ سے

جذب و سلوک

کام ہونا چاہئے و عدوں سے کچھ حاصل نہیں
اب فقط اُمید ہی وجہِ سکونِ دل نہیں

دل میں سب کچھ ہے مگر اظہار کے قابل نہیں
دوسرا دل ہے ہمارا عقدہ مشکل نہیں

اہلِ غیرت ہیں پشیمانیٔ ماضی سے ہلاک
حال میرا یہ کہ مجھ کو فکرِ مستقبل نہیں

گردشوں سے ساز ہی آوارہ بختی کو مری،
اُس طرف مشعل دکھاتی ہے جدھر منزل نہیں

جس کو دیوانے ترا حُسنِ کرم سمجھا کئے
وہ فریبِ لطف ابتدائے الست کی قابل نہیں

وہ کسی ڈھب سے سہی، ہے تو انھیں میرا خیال
ظلم کے قابل تو ہوں، گو رحم کے قابل نہیں

کاہشِ واماندگی سے تو نہیں واقف ہنوز
اُسکے دل سے پوچھ جو آسودۂ منزل نہیں

اک صدا کنجِ قفس سے آئی اور تڑپا گئی،
کوئی کہتا تھا، رہا ہونا مرا مشکل نہیں

غم کا درماں سہل ہے لیکن جو دل ہو غم شناس
یعنی جس مشکل کا ہو احساس وہ مشکل نہیں

آگ لگ جائے گی سوزِ دل سلامت چاہئے
ہم تو باقی ہیں، جو باقی گرمیِ محفل نہیں

کامیابی کی تمنا ہے تو کچھ تدبیر کر
صرف قسمت کا گلہ کرنے سے کچھ حاصل نہیں

شوق کی پامردیوں ہیں عزمِ راسخ چاہیئے
ہو نہ جس کی انتہا ایسی کوئی منزل نہیں

ہو چکیں طے جادۂ مقصود کی دشواریاں
اب نئی مشکل کوئی اس راہ میں حائل نہیں

ہیں ہماری نارسائی کے بظاہر دو سبب
یا تو آگے بڑھ گئے ہم یا ابھی منزل نہیں

آزمائش سرفروشوں کی ہوئی ہے بار بار
امتحاں گاہِ وفا کوئی نئی منزل نہیں

ہے گذرگاہِ طلب میں احتیاجِ احتیاط
یہ وہ منزل ہے ابھی جسکی حدیں کامل نہیں

پھر وفا کی محفلیں آراستہ ہو جائیں گی،
ہمتِ دل کو غمِ تاراجیٔ محفل نہیں

جوش کہتا ہے لگا دو وسعتِ ہستی میں آگ
عقل کہتی ہے کہ وقتِ گرمیٔ محفل نہیں

سالکِ تدبیر ہوں غالب نہیں جذبِ خروش
ناشکیب اتنا ابھی سیمابؔ میرا دل نہیں

روحِ اعظم ؐ

ساقیٔ بزمِ کائنات، قاسمِ کیفِ بیخودی
آیۂ رحمت و نجات، عقدہ کشائے زندگی

غازۂ مہرِ تابناک، ہے تری رہگذر کی خاک
ذرۂ آستانِ پاک، کوکبِ افسرِ شہی

کان جب آشنا نہ تھے نغمۂ صبحِ عرش سے
ظلمتِ کفر زار میں پہلی اذان تو نے دی

عیدِ ناقص

اے مسلماں، اے خرابِ نشۂ نام و نمود
ہو چکا مسرور مفروضاتِ روزِ عید سے

تو لباسِ نو پہن کر خوب اتراتا پھرا
سانپ لہراتا ہو جیسے کھال کی تجدید سے

صبح کھانے اور پینے میں رہا مصروف تو
اپنا معدہ صاف کر کے مسہل و تبرید سے

شام کو تھا حسنِ آوارہ ترا کیفِ نظر
تھیں عیاں بدمستیاں تیرے مذاقِ دید سے

تو رہا خوش قامتوں سے خوب دن بھر ہمکنار
بوالہوس کی طرح، حظِ نفس کی امید سے

الغرض یہ عید تھی تیری بہ مقدارِ ہوس
ہے ترا انجام ظاہر اس تری تمہید سے

کیا ترے دل میں ذرا بھی الفتِ اسلام تھی؟
کیا تجھے کچھ واسطہ تھا جذبۂ توحید سے؟

کیا اسیروں کا الم تیری خوشی میں تھا شریک؟
تیرگی نازل تھی تجھ پہ مطلعِ خورشید سے؟

کیا ترا اسراف تیری جیب کا ممنون تھا؟
کیا تو خوش تھا اپنے دل کی واقعی تنقید سے؟

سچ بتا کیا مائلِ احساس تھا تیرا ضمیر؟
ملتِ اسلام کی تہدید یا تحدید سے؟

اپنی "عیدِ ظاہری" پر اک نگاہِ فکر و غور! عذرِ بے معنی نہ کر تاویل اور تردید سے
آگ پھیلے گی نہ کیا تیرے بُرے اعمال کی؟
تیری نسلیں کیا نہ بگڑیں گی تری تقلید سے؟

ذرّوں کا مستقبل

نہ ٹھکرا خاک کے ذرّوں کو یوں پائے حقارت سے
کہ ہر ذرّہ ہے اک جزوِ حسیں اجسامِ ہستی کا

خزانے دفن ہیں زیرِ زمیں حُسن و لطافت کے
یہیں موجود ہے سامان اس بربادِ بستی کا

خمیدہ سر تو ہو، وسعت تو دے ذوقِ بصیرت کو
ہر اک نقشِ فسردہ درس ہے رفعت پرستی کا

غرور و کبر جو ہر بنکے ابتک اُڑ گئے ہوتے
اگر ٹھنڈا نہ پڑتا جوشِ آتش زارِ ہستی کا

یہ ہر ذرّہ، حقیقت جس کی سمجھی ہی نہیں تُو نے
ستارہ ہے ستارہ! آسمانِ نازِ ہستی کا

پسِ تکمیل جب اجسام مِل جاتے ہیں مٹی میں
اُبھر آتا ہے ذرّہ بن کے حصّہ نقصِ ہستی کا

ہیں مستقبل کے نقشے جن کو ذرّے جانتا ہے تو
بساطِ دہر مقتل ہے فنا کی چیرہ دستی کا

یہی ذرّے کسی دن جوشِ خلقت سے جواں ہونگے
انھیں ذرّوں سے پیدا پھر زمین و آسماں ہونگے

سوسائٹی

وہ اک ناپاک مجمع، وقت ضائع کرنے والوں کا
وہ ہیبت ناک مرکز زہر آلودہ خیالوں کا
مہذب ایک محفل ڈاکوؤں کی اور لٹیروں کی
منظّم ایک ٹولی شعبدہ ساماں سپیروں کی
وہ ناجائز جتھا، خود رائے، خود بیں، خود پرستوں کا
وہ ناشائستہ حلقہ، بے حیاؤں، فاقہ مستوں کا
خطرناک اک جماعت، خود غرض، بے اعتمادوں کی
شر انگیز ایک مجلس، وقت کے شیطان زادوں کی
وہ اک باطل کدہ، حق کی جہاں پرسش نہیں ہوتی
"ضمیر و روح" کی تا دور گنجائش نہیں ہوتی
وہ سازش گاہ، ہوتی ہے جہاں تخریب انساں کی
وہ آتش گاہ بھکتی ہے جہاں تہذیب انساں کی

جہاں بدرسمیوں کی ڈال دی جاتی ہیں زنجیریں،
جہاں بربادیٔ اخلاف کی ہوتی ہیں تدبیریں
ریاکاری جہاں ڈھلتی ہے مکاری کی سانچوں میں
جہاں اقبال جلتا ہے حسد کی تیز آنچوں میں
وہ اک مذبح جہاں کٹتی ہے گردن بیگناہوں کی
وہ اک مقتل جہاں چلتی ہیں چھریاں کج نگاہوں کی
وہ شورش گہ، جہاں فتنے نئے بیدار ہوتے ہیں
جہاں قانون بغض و کبر کے تیار ہوتے ہیں
کہاں جاتا ہے تو لٹنے کو اس طوفانِ غارت میں؟
جسے سمجھا ہے "جنت"، وہ جہنم ہے حقیقت میں
نہ جا "محفل"، میں اک "دل" ڈھونڈ اور اس میں نہاں ہو جا
سکوں درکار ہے تو بے نیازِ این و آں ہو جا

زِ دنیا بے تعلق باش، وانگہ ہر چہ خواہی کُن
بہ جلوت دل میا ویز و بہ خلوت بادشاہی کُن

صورِ ہجرت

(وَاهْجُرْهُمْ هَجْرًا جَمِيلًا)

جب وطن کی سرزمیں گھر جائے استبداد سے
جب جہنّم پھوٹ نکلے خرمنِ فریاد سے

جب ہوں بیحد سختیاں گمراہی و عدوان کی
جب صدا آنے لگے ہر سانس سے شیطان کی

جب حقیقت پر گراں ہو جائے باطل کا حجاب
جب پسینہ ظلم کی بدبو سے بن جائے شراب

جب رگیں انسانیت کی بربریت توڑ دے
بیکسی کو جب غرورِ نفس تنہا چھوڑ دے

جب نوا سنجی دبائی جائے شورِ جنگ سے
خون ٹپکے پھول کے اوراقِ زنگا زنگ سے

جب غریبوں کا لہو پینے لگیں سرمایہ دار
جب فقط اغراض پر نیّت کا ہو دار و مدار

جب وطن میں جوشِ زن بیداد کا طوفان ہو
اور جب ماحول اس درجہ غلط سامان ہو

عزمِ ہجرت چاہیے رشتے وطن کے توڑ کر
جس طرح موتی نکل آتا ہے سیپی چھوڑ کر

ہجرت اک حربہ ہے تسلیم و رضا کے ہاتھ میں
ہجرت اک رگ ہے حمیّت کی وفا کے ہاتھ میں

ہجرت اک احساس ہے روٹھا ہوا بپھرا ہوا
ہجرت اک جذبہ ہے خودداری سے گرمایا ہوا

ہجرت اک گہرا طمانچہ سرخ رخساروں پہ ہے
ہجرت اک مضبوط تیشہ آہنی تاروں پہ ہے

ہجرت اک خاموش جنگِ حق و استبداد ہے
ہجرت اک دل دوز، بے الفاظ کی فریاد ہے

ہجرت اک مظلومیت کا ہے مقدس احتجاج
ہجرت اک دردِ غلامی کا ہے روحانی علاج

ہجرت اک تمہید ہے وصلِ دلِ مہجور کی،
ہجرت اک تجدید ہے عزمِ طلب دستور کی

ہجرت اک حملہ ہے مجبوری کا قصرِ جبر پر
ہجرت اک ٹھوکر ہے پندار و حسد کی قبر پر

فائزِ ہستی ہے جو اس راہ کا رہگیر ہے
منزلِ لیلےٰ کی ہجرت آخری تدبیر ہے

شہید

دخلِ بیگانہ کہاں جلوہ گہِ راز میں ہے
ہے کوئی اور، جو اس منزلِ ممتاز میں ہے

وہ اجل دوست، وہ پروردۂ آغوشِ قضا
زندگی جس کی نگاہِ غلط انداز میں ہے

کھیلنا خاک میں اور خون میں جس کو ہے پسند
جس کی اک خاص جگہ انجمنِ ناز میں ہے

جسے پروائے لحد ہے نہ تمنائے کفن
رنگِ تسلیم و رضا جس کے ہر انداز میں ہے

حدِ معلومۂ ہستی سے گذرتا ہی نہیں
صرف اک یہ ہے وہ انسان جو مرتا ہی نہیں

خزاں سے کیجئے شکوہ چمن کو کیا کہیے
فسردگیِ گل و نسترن کو کیا کہیے

وہ حسن غارتِ اہلِ جہاں ہے سر تا پا
ادا کو موت کہا، بانکپن کو کیا کہیے

ہر ایک خم میں ہیں عقدے ہزار لاینحل
کسی کی زلفِ شکن در شکن کو کیا کہیے

ہوائے نغمہ نے جان اور دل کو پھونک دیا
گدازِ سازِ سرِ انجمن کو کیا کہیے

صنم کدے سے پھرا شیخ، کیا علاج اسکا
حرم سے پھر گیا برہمن کو کیا کہیے

ہر اک صدا سے ہے بیدار اک قیامتِ نو
یہی ہے نغمہ تو پھر نغمہ زن کو کیا کہیے

لب و زباں کو بھی اب ساز باز ہے اُس سے
وبالِ کام و دہن ہے، سخن کو کیا کہیے

بنایا مالکِ کُل، دے کے رہبروں کو پناہ
خرابِ اہلِ وطن ہیں، وطن کو کیا کہیے

جہاں تھی موجِ رواں، خاک اُڑ رہی ہے وہاں
خرامِ تشنہ گنگ و جمن کو کیا کہیے

نہ ہونا چاہیئے غمّاز کی صدا پہ ہلاک
فریب خوردگیِ کوہکن کو کیا کہیے

ریائے باطل و پندار کی نمائش ہے
سرائے دہر طلسمِ فریب و سازش ہے

مُنافِق

منافق، جس کو مارِ آستیں کہتے ہیں دُنیا میں — وہ ہے اک "خطرۂ خاموش" آغوشِ تماشا میں

لہو پیتا ہے بنکر سانپ، اخلاص و محبت کا — وہ ڈاکو ہے، وہ غارتگر ہے انسانی شرافت کا

تبسّم اس کے لب پر صرف دھوکا یا نمائش ہے — حقیقت کے چھپا لینے کی اک ناپاک کوشش ہے

عیاں اُس کے تکلم سے حلاوت ہے محبّت کی — مگر ہر لفظ میں پنہاں ہے سمیّت ہلاکت کی

بظاہر اس کی باتوں سے ہوا خواہی ٹپکتی ہے — ریا کی آگ لیکن اُس کے سینے میں بھڑکتی ہے

وہ اک تنّور ہے جس پہ پیدا ہے سکوں افشاں — وہ اک زنبور ہے جو ہے غلافِ رنگ میں پنہاں

دل اُس کا مزبلہ ہے اور گندہ ہے زباں اُس کی — کثافت سے ہیں آلودہ خیال آرائیاں اُس کی

زباں پر کچھ ہے دل میں کچھ، نمونہ ہے دورنگی کا — خود اُس کا ہر عمل شاہد ہے اُس کی ظرف تنگی کا

وہ اک شیطان ہے، انساں کی پُر اسرار صورت میں — وہ اک طوفان ہے، سمٹا ہوا خس پوش خلوت میں

وہ اک بہروپیا ہے، ایک نقّالِ شرافت ہے — وہ اک انسانِ مصنوعی ہے ننگِ آدمیّت ہے

خبردار اس سے، اے یارانِ سادہ، ہوشیار اس سے — کہیں مانوس ہو جائے نہ چشمِ اعتبار اس سے

منافق کو تم اپنے دل کی دنیا سے جدا کر دو
حدودِ دوستی سے اس کی ہستی کو فنا کر دو
کچل ڈالو، لگا کر ٹھوکریں نفرین و لعنت کی
منافق ہے بڑی توہین دنیائے محبت کی
مٹا دینا ہی اس کا مصلحت اے اہلِ عالم ہے
کہ فردوسِ وفا میں یہ مجسم اک جہنم ہے

مسلم یونیورسٹی سے خطاب

اے عروسِ علم، اے روحِ عمل، عمرت دراز
کچھ مجھے کہنا ہے تجھ سے بہ سبیلِ اہتزاز
مصلحت نے مغربی قالب میں ڈھالا ہے تجھے
تیرے نغمے ہیں حجازی گو کلیسائی ہے ساز
کھینچ لے گی قلب جس پردے میں اٹھے گی تو
پاسِ بربط کر نہ اے موسیقیٔ بربط نواز
دلفریبی گیسوئے مغرب کی دامن کش سہی
ہے بہت باقی ابھی سیرِ خمِ زلفِ ایاز
جادۂ تجدید میں اپنی الگ دنیا بنا
ڈھونڈنے آئے جسے نظارۂ مغرورِ ناز
دے سکے تیری نوا پیغامِ تسکیں قوم کو
بن سکے صورِ حقیقت تیری آہنگِ مجاز
ارتقا کی دوش پر خود عرش ہو تیرا عروج
طرز میں اک اعتلا ہو وضع میں اک امتیاز
جذبۂ پابندیٔ تقلید کو تعطیل دے
درسِ دیرینِ حرم کو فرصتِ تکمیل دے

جوشِ انتقام

اُٹھا دو چنگ و رباب اپنی بزمِ عشرت سے
کہ آ رہا ہوں میں صد محشرِ جنوں بردوش

ہے میرے ساتھ پریشانیوں کی اک دنیا
بپائے حشر چکان و فغانِ صور فروش

نظامِ بزمِ محبت کو فرصتِ تغییر
اک انقلاب ہے میرے ورود میں پردہ پوش

شروع ہوتے ہیں کچھ واقعاتِ نوساماں
مغنیہ سے کہو ختم کر فسانۂ دوش

مسل کے پھینک دو پھولوں کو آئینے توڑ دو،
ہٹا دو پردۂ رنگین و مسندِ گل پوش

میں ذمہ دار نہیں برہمیٔ محفل کا
کہ میری بے خبری ہے وداعِ عالمِ ہوش

اب اپنے ناز سے ہشیار مستیٔ مینا،
اب اپنی خیر منائے غرورِ بادہ فروش

مری نظر میں فنا سانس میں ہلاکت ہے
میں ہوں خرابِ پریشانی و خرابی کوش

خلوص و مہر و محبت کا ماتمی ہوں میں،
فریب خوردۂ نقشِ ستم بہ پردہ نوش

حقیقتوں پہ ہیں آثارِ تیرگی طاری
سحر نہیں ہے کہ ہو جاؤں مثلِ شمع خموش

مجھے جہانِ ریا کی جڑیں ہلانی ہیں
ملا ہے اذنِ تکلم بہ اقتضائے سروش

اب انکشاف کی قوت سے کام لینا ہے
منافقوں سے مجھے انتقام لینا ہے

اعلانِ جنگ دعوتِ انقلاب

غلام آبادِ ہستی میں ایک "حسینؑ" کی پھر ضرورت ہے!

نہیں جو مائلِ تجدید اب جہاں کا نظام
اعادہ خواہ ہے تاریخِ ماضیٔ ایام

جو رنگِ دہر تھا پہلی صدی کے آخر میں
اسی کے ہاتھ میں ہے چودھویں صدی کی لگام

وہ ہی فجور وہ ہی فسق کی ہے ارزانی
وہ ہی خودی ہے وہ ہی خود روی شعارِ عوام

ہزار آئے زمانے میں انقلاب مگر
وہ ہی ہے مستیٔ عشرت، وہ ہی ہے گردشِ جام

نماز و روزہ پہ ہونے لگا ہے استہزا
کوئی ہے بندۂ دولت، کوئی بتوں کا غلام

کوئی ضمیر فروش اور کوئی دین فروش
عجب نہیں جو خدا کا یہ بول دیں نیلام

اسی کے ہاتھ پہ بیعت کو لوگ بڑھتے ہیں
جسے سمجھتے ہیں رمز آشنائے شُربِ مدام

حریصِ سجدہ شوالے میں ہے بتِ پندار
حریفِ ربِّ حرم ہے مجاورِ اصنام

پلی تھی سایے میں جو قوم تیغ و خنجر کے
اب اُس کو صرف جمود و خمود سے ہی کام

تو کیا یہاں بھی نتیجہ وہی نہ نکلے گا؟ — ہوا تھا پہلی صدی میں جو وقت کا انجام
شہیدِ قوم نہ کیا آج کوئی اُٹھے گا؟ — مذاقِ "جاہدو" درسینۂ خنجرے بہ نیام
الٰہی بھیج دے ابنِ علی رض کو پھر اک بار — کہ ہر طرف سے ہے خطرے میں حرمتِ اسلام
وہ آئیں اور کریں انتظامِ ملت دیں — جہاں میں باعثِ تنظیم ہو نزولِ امام
جہانِ کفر کو پیغامِ جنگ دیں آ کر — یہ فتحِ خاص لکھی جائے ذوالفقار کے نام

حسینؑ ابنِ علیؑ، وہ مجاہدِ ملت — کہ جن کے نام سے لرزش میں ہے خرابۂ شام
شہیدِ جور و قتیلِ جفا و کشتۂ قوم، — شجاع و صابر و مردِ وفا قبولِ انام
(ہوں اُن پہ اور تمام اہلبیت پر اُن کے — ہر ایک لمحے میں لاکھوں درود اور سلام)

غلط کہ وقت کی تجدید فرضِ عین نہیں
یزید اب بھی ہیں لاکھوں کوئی حسینؑ نہیں

مزدور

گرد چہرے پر، پسینے میں جبیں ڈوبی ہوئی
آنسوؤں میں کہنیوں تک آستیں ڈوبی ہوئی
پیٹھ پر ناقابلِ برداشت اک بارِ گراں
ضعف سے لرزی ہوئی سارے بدن کی جھرّیاں
ہڈیوں میں تیز چلنے سے چٹخنے کی صدا
درد میں ڈوبی ہوئی مجروح ٹخنے کی صدا
پاؤں مٹّی کی تہوں میں میل سے چِکٹے ہوئے
ایک بدبودار میلا چیتھڑا باندھے ہوئے
جا رہا ہے جانور کی طرح گھبراتا ہوا
ہانپتا، گرتا، لرزتا، ٹھوکریں کھاتا ہوا
مضمحل واماندگی سے اور فاقوں سے نڈھال
چار پیسے کی توقّع، سارے کنبے کا خیال

اپنے ہم جنسوں کی بے مہری سے مایوس و ملول
صفحۂ ہستی پر اک سطرِ غلط، تہ فضول
اپنی خلقت کو گناہوں کی سزا سمجھے ہوئے
آدمی ہونے کو لعنت اور بلا سمجھے ہوئے
زندگی کو ناگوار اک سانحہ جانے ہوئے
بزمِ کبر و ناز میں فرض اپنا پہچانے ہوئے
راستے میں راہگیروں کی نظر سے بے نیاز
شورشِ ماتم سے، نغموں کے اثر سے بے نیاز
اس کے دل تک زندگی کی روشنی جاتی نہیں
بھول کر بھی اس کے ہونٹوں پر ہنسی آتی نہیں
ایک لمحہ بھی نہیں فکرِ معیشت سے نجات
صبح ہو یا شام، ہے تاریک اس کی کائنات
دیکھ اسے قارونِ اعظم، دیکھ اے سرمایہ دار!
نامرادی کا مرقّع، بے کسی کا شاہکار
گو ہے تیری ہی طرح انساں، مگر مقہور ہے
دیکھ اے دولت کے اندھے سانپ! یہ مزدور ہے

نوجوانِ ہندوستان سے

قدیم دورِ حدیثِ چمن تمام ہوا — طویل قصۂ سرو و سمن تمام ہوا
سجاؤ ایک نئی بزم شام سے پہلے — سحر ہوئی، اثرِ انجمن تمام ہوا
جو میکدہ میں تھا ہنگامہ آفریں کل تک — وہ آج شورِ "بسیار و شکن" تمام ہوا
نئے سبو، نئے پیمانے بار یاب کرو — تمام مایۂ یارانِ فن تمام ہوا
حریمِ نو سے مغنیٔ نو کو دو آواز — شکستہ نغمۂ سازِ کہن تمام ہوا
ابھی ہے جوش پہ گرمیٔ محفلِ منصور — کہاں فسانۂ دار و رسن تمام ہوا
نشاطِ کار تو باقی ہے، ہم نہیں نہ سہی — غلط خیال ہے، کارِ وطن تمام ہوا

حیاتِ تازہ ہے، انجام ہر حیات کے بعد
طلوعِ صبحِ دگر لازمی ہے رات کے بعد

بہار، موت کا پیغام ہے خزاں کیلئے — یہ انقلاب مبارک ہو باغباں کیلئے
نہ خاکِ جادہ اگر پیشِ رَو کو جذب کرے — تو راہ بند ہو، پس ماندہ کارواں کیلئے

نئی نئی روشیں باغ میں ہوئیں پیدا — نوید سیر، جوانانِ گلستاں کیلئے
نئے اصول مرتب کریں برائے چمن — بنائیں کچھ نئے آدابِ آشیاں کیلئے
بہار اب کے جو آئے تو پھر نہ جائے کبھی — ہو بندوبستِ قفس، عیشِ جاوداں کیلئے
جبینِ ذوق مہیا کرے نئے سجدے — وطن کی خاک محبت کے آستاں کیلئے
نئی فضا ہے، نئی آرزو، نئے جذبات — دعائے خیر، تمنائے رفتگاں کیلئے

جواں دلوں میں پھر اک عزم کامیاب ہے آج
وطن بخیر، وطن پر نیا شباب ہے آج

حقیقتِ چمنستانِ روزگار ہو، تم — حفاظتِ گل و لالہ کے ذمہ دار ہو تم
عجب نہیں جو بڑھے ہی جوشِ گرمیٔ محفل — فروغِ محفلِ رفتہ کی یادگار ہو تم
اگر ہو نالہ کناں، اک مہیب طوفاں ہے — اگر ہو نغمہ فشاں، صورِ رہگذار ہو تم
جو آفتاب پہ چھا جائے تم وہ ذرہ ہو — جو دوشِ برق پہ چمک جائے وہ شرار ہو تم
ترقیوں کا گرجتا ہوا ہو تم بادل — لطافتوں سے مہکتی ہوئی بہار ہو تم
ہے ایک کھیل پہونچنا تمہارا منزل پر — رکاب جس کی ہوا ہے وہ شہسوار ہو تم
تڑپ رہا ہے تمہاری رگوں میں سوزِ حیات — ابھی جو گرم ہے وہ خونِ لالہ زار ہو تم
تمہارے حوصلوں پر اعتبار کرکے چلے — تمہیں سپرد ہم اپنی بہار کرکے چلے

عزّتِ نفس

میں نے کل اک پھول سے پوچھا کہ اے مستِ نمو　　نوجوانانِ چمن سے کیوں کھچا رہتا ہے تو؟

عرش سے موتی برستے ہیں ترے اوراق پر　　روشنی پڑتی نہیں لیکن ترے اخلاق پر

سر ہلا کر یا تو وہ موتی گرا دیتا ہے تو　　یا انھیں خورشید کے آگے بڑھا دیتا ہے تو

جمع کرتے ہیں جو سرمایہ ستارے رات بھر　　تو ملا دیتا ہے اُسکو خاک میں وقتِ سحر

بوسے لیتی ہیں اگر بوندیں، بگڑ جاتا ہے تو　　اپنے اور رنگِ تجمل پر اکڑ جاتا ہے تو

جب صبا آغوش میں لے کر جھُلاتی ہے تجھے　　مجلسِ رنگیں سے جھوٹی شرم آتی ہے تجھے

کنجِ رنگا رنگ میں گُم صُم پڑا رہتا ہے تو　　بات سُنتا ہے کسی کی اور نہ کچھ کہتا ہے تو

کیوں نہیں تو آتشِ ہنگامہ آبادِ چمن؟　　اے اسیرِ رنگ و بو اے شمعِ آزادِ چمن

نالہ ہے صد حشر در بر، تو تغافل کوش ہے　　شوق ہے صد نالہ برلب اور تو خاموش ہے

درد خواہِ کیستی و داد خواہِ کیستی؟

این چنیں رنجیدہ برنجیدہ نگاہِ کیستی؟

ہنس کے بولا پھول اے شکوہ طرازِ خامشی　　آج تک تجھ کو نہیں معلوم رازِ خامشی

یہ مرا حُسنِ متانت، شرطِ آب و رنگ ہے ۔۔۔ ورنہ میرے ضبط سے خود ظرف میرا تنگ ہے
میں نہ شبنم کے اگر موتی گرا دوں خاک پر ۔۔۔ چاند تاروں میں ہو کیوں عظمت مری افلاک پر
خندہ بر لب بوسہ باراں سے گر ہو جاؤں میں ۔۔۔ بجلیوں میں آشیانے کی طرح کھو جاؤں میں
باغ میں جو سر کشیدہ شاخ پر رہتا ہوں میں ۔۔۔ دستِ گلچیں سے نڈر لا بے خطر رہتا ہوں میں
اپنی عطریّت کا میں گر خود نہ اندازہ کروں ۔۔۔ کس طرح تیرے مشامِ روح کو تازہ کروں
گر نہ سمجھوں ہر ورق کو اپنے عنوانِ بہار ۔۔۔ مجھ سے کیوں مانوس ہو زلفِ پریشانِ بہار
آتشِ گلشن ہوں اپنی گرمیٔ پُر جوش سے ۔۔۔ سب یہ ہنگامے ہیں میرے جلوۂ خاموش سے
ملتفت دُنیا مرے آئینِ بے زاری سے ہے ۔۔۔ کیفِ نظّارہ اسی ترکیبِ خودداری سے ہے

خود نمائی کا گلہ برحق، مگر یہ عرض ہے
اپنی عزّت خود کروں، یہ بھی مرا فرض ہے

کسی کی یاد میں

دَورِ صیاد میں اس درجہ ہوا غم مجھ کو
اب مسرّت کبھی ہوتی ہے، مگر کم مجھ کو

ہم نفس فکرِ خوشی کیا جو بہار آئی ہے
زندگی میں ہے فقط، فرصتِ ماتم مجھ کو

اپنے بچھڑے ہوئے احباب کا ہی سوگ مجھے
بزمِ عبرت ہے، طرب خانۂ عالم مجھ کو

ہے ابھی پیشِ نظر رخصتِ یارانِ چمن
ابھی رونا ہے بہت صورتِ شبنم مجھ کو

ابھی خالی ہیں وہ شاخیں جو کبھی تھیں گُل ریز
نظر آتا ہے یہ گلشن ابھی مبہم مجھ کو

صحنِ گلشن میں وہ ہنگامۂ پرواز نہیں
ساز موجود ہے، پیدا مگر آواز نہیں

باغباں نظمِ غلط سے ہے پریشان ہنوز
آشیانوں میں سکوں کا نہیں سامان ہنوز

پتّے پتّے سے ہی طاری وہ ہی ہیبت اب تک
ذرّے ذرّے میں بپا ہے وہ ہی طوفان ہنوز

منزل اک قافلۂ نو سے پریشاں ہے ابھی
قافلہ ندرتِ منزل سے ہی حیران ہنوز

عظمتِ رفتہ کے آثار کہاں ہیں پیدا
غلطی خیز فضائیں ہیں پشیمان ہنوز

ایک بھولی ہوئی امید برآئی ہے ، مگر — دلِ افسردہ میں باقی ہیں کچھ ارمان ہنوز

کہیں گل ہیں، کہیں گلچیں ہے، کہیں مالی ہے
ابھی صدرِ چمنستاں کی جگہ خالی ہے

یعنی وہ بلبلِ شوریدہ وہ آوازۂ چمن — رنگ افروزِ چمن، زمزمہ پردازِ چمن
نغمہ برلب ابھی گلشن میں کہاں پہونچا ہے — ابھی خاموش ہے پھولوں کی طرح سازِ چمن
جس کے دل میں ہے وفاؤں کی امانت ابتک — جس کے سینے میں ہے محفوظ ابھی رازِ چمن
جانبِ صحنِ چمن پھر وہ بصد ناز آئے — اُسکے قدموں پہ جھکے خانہ براندازِ چمن
اُس کے نغموں سے منظّم ہو چمن از سرِ نو — پھر ہو ماحولِ چمن حاملِ اعزازِ چمن

باز از جلوۂ او کیفِ نظر تازہ کنم
تا بوجد آیم و تبریک دگر تازہ کنم

اے چراغِ صبح سن!

اے چراغِ صبح، افسانہ فروزِ انجمن — اے مرے دل سوز، اے تصویرِ سوزِ انجمن

لے گیا کوئی تماشائے مسرت لوٹ کر — پڑ گئی پھیکی ادائے سینہ دوزِ انجمن

میرے دل پر بھی ہو داغِ برہمیٔ بزمِ عیش — آہ! میں بھی تھا شریکِ تیرہ روزِ انجمن

ہر جلیسِ بزم، سرخوش تھا مئے دوشاب سے
اور تُو ضو ریز اپنے جلوۂ شب تاب سے

آہ میں آگاہ کب تھا اس طلسمِ راز سے — بے خبر تھا گردشِ چرخِ ستم انداز سے

پردۂ چشمِ تماشا بن گئی حیرت مری — ہو گئے غارت وہ جلوے جلوہ گاہِ ناز سے

صبح ہو تو خونِ دل آنکھوں میں بھر بھر کر پیوں — کیا یہی مطلب تھا دورِ بادۂ شیراز سے

ساغرستانِ طرب میں شورِ ناؤ نوش تھا
مدعی سب ہوش میں تھے اور میں بیہوش تھا

سب ہوئے اس بزمِ عشرت میں ہم آغوشِ نشاط — اور محویت رہی میری اثر پوشِ نشاط

مجھ کو رکھا قسمتِ تشنہ نے محرومِ سرور — عام تھی گو مستیٔ صہبائے سرجوشِ نشاط
تیرگیٔ قسمت کی یوں طاری نہ ہو جاتی اگر — خوب تھی فردائے اضمحلال سیہ دوشِ نشاط

اب تو یادِ وقتِ رفتہ، زحمتِ احساس ہے
آنکھ پر ہے دامنِ تر اور صبحِ یاس ہے

ہم نشین، ہیں تجھ سے وجہ سرگرانی کیا کہوں؟ — آہ! اپنا حال اپنی ہی زبانی کیا کہوں؟
خوف سے میری طرح تو بھی نہ پھک جائے کہیں — آتشیں افسانۂ سوزِ نہانی کیا کہوں؟
داغ جو دل پر نمایاں ہیں انھیں کو دیکھ لے — اور جل بجھنے کی اپنے میں کہانی کیا کہوں؟

رہ گیا ہوں یادگارِ کاروانِ سوختہ
آہ، اک نقشِ فسردہ، اک نشانِ سوختہ

مجھ سے برگشتہ رہا وہ آئینہ آرائے بزم — مجھ تک آنے بھی نہ پایا، پھر گیا مینائے بزم
میری محرومی پہ تھے آثارِ محفل خندہ زن — قسمتِ محروم نے مجھ کو کیا رسوائے بزم
میں مثالِ قیس، شوریدہ سرِ امیدِ دید، — صد حجابِ کم نگاہی میں نہاں لیلائے بزم

لطفِ ساقی بیکراں تھا اور عالمگیر تھا
میں ہی صرف اس بزم میں آزردۂ تقدیر تھا

اس کے دستِ ناز تھے مصروفِ پیمانِ وفا — ہاتھ پھیلائے ہوئے تھے تشنہ کامانِ وفا

تھی بہت ارزاں جسے کہتے ہیں جنسِ دلدہی جمع تھا ہر گوشۂ محفل میں سامانِ وفا
تھے حریفوں کے لئے نغمے نگاہِ مست کے اور میں سر در گریباں، مرثیہ خوانِ وفا

وہ سماں تسکینِ دہِ ہر خاطرِ ناشاد تھا
میں بایں ساماں دہی برباد کا برباد تھا

سرد ہے وہ انجمن، جو تھی حق و باطل فروش لے گئے حصّہ بقدرِ ذوق و قسمت، دل فروش
عیش منزل ہے رہینِ ظلمت و بے رونقی ہو گیا نظروں سے پوشیدہ مہ منزل فروش
کون ہے اب، کس سے سودائے محبت کیجیے؟ آہ، باقی ہے وہ محفل، اور نہ وہ محفل فروش

جنسِ من صرفِ حریفاں شد، خریداری کجا
یوسفم ہمراہِ گرگاں، گرم بازاری کجا

تضمین بر رباعیاتِ خیامؒ

گھنگور سی اک مست گھٹا چھائی ہو — سرسبز کوئی مقام صحرائی ہو
دنیا میں یہی ہے زندگی کا حاصل — شاہد ہو شراب اور تنہائی ہو

ساقی ہو وہی جو مست و بیخود کر دے — رنگین لبوں سے بادہ کوثر دے
جب دیکھ لے میکشِ محبّت کی طرف — مستیِ نگاہ سے صراحی بھر دے

جب حُسنِ ازل ہو جلوہ گر آنکھوں پر — اور کیفِ شباب کا اثر آنکھوں پہ
یہ حرمتِ نظارہ ہے اے اہلِ نظر — دل پہ رہے ہاتھ اور نظر آنکھوں پہ

عادت ہی نہیں تو شادماں کیا ہوگا — مسرورِ طرب گاہِ جہاں کیا ہوگا
عقبیٰ ہے خمارِ کیفِ دُنیا غافل — جب کچھ نہ ہوا یہاں، وہاں کیا ہوگا

ہو کر آزاد عیش و عشرت کر لیں
حاصل مے و محبوب سے راحت کر لیں
کرتے رہیں انتظارِ جنت کب تک؟
ہم اپنی ہی دُنیا کو نہ جنت کر لیں!

گویند بہشت و حورِ عین خواہد بود
و انجا مے ناب و انگبیں خواہد بود
گر ما مے و معشوق پرستیم رواست
چوں عاقبتِ کار چنیں خواہد بود

جب یاد تصور میں تری آتی ہے
جلوے دلِ بیدار پہ برساتی ہے
نظروں میں مری وادیِ ایمن کی طرح
بجلی اک کوندتی ہی چھپ جاتی ہے

بے پردہ ہوا نشاطِ عالم ہو کر
جھوما نظروں میں کیف اور کم ہو کر
آخر اسی آلودہ صراحی سے مری
نکلا کوئی مستیِ مجسم ہو کر

کیا فرض ہے یہ کہ وہ تجھی کو دیکھے
تیری ہی نگاہِ بے خودی کو دیکھے
آئینِ تماشا تو یہ ہے اسے خود بیں
تو دیکھ اسی کو وہ کسی کو دیکھے

غرقِ انوارِ جلوہ گر ہو جائے　　اپنی ہستی سے بے خبر ہو جائے
نظارہ اُسی کا ہی جو وقتِ دیدار　　خود دیکھتے دیکھتے نظر ہو جائے

ہو محوِ جمال آنکھ والا ہے وہی　　جو سامنے بیٹھا رہے شیدا ہے وہی
وہ طور ہے جس پہ ہو کوئی جلوہ نما　　جھیلے جو نظر کی چوٹ موسیٰ ہے وہی

اے دیدہ بیا لقائے منظور ببیں
آں جبہہ و آں جمال و آں نور ببیں
در وادیِ ایمنِ محبّت بگذر
ہم موسیٰ و ہم درخت و ہم طور ببیں

دعوتِ فکر و غور

کبھی کیا اس پہ غور تو نے، یہ خاکدانِ خراب کیا ہے؟
یہ صبح کو ارتحال کیوں ہے، یہ رات کا انقلاب کیا ہے؟

تغیرات اور علی التواتر، تصرفات اور بے محابا
کمالِ حسن و جمال کیا ہے، زوالِ شیب و شباب کیا ہے؟

ہے آدمی جلوہ دار کس کا، یہ خاک ہی پردہ دار کس کی؟
یہ روح، یعنی حیات کیا ہے؟ یہ جسم یعنی نقاب کیا ہے؟

یہ نغمے کیوں حشرِ سامعہ ہیں، خمار کیوں ہے مآلِ مستی؟
سرود میں یہ صدا ہے کیسی، نوائے چنگ و رباب کیا ہے؟

بہار کی اصل و بود کیا ہے، اہیں رقص ہیں آبشار کب سی؟
ہے سرحدِ رنگ و بو کہاں تک، طلسمِ زارِ حباب کیا ہے؟

یہ موت اور یہ حیاتِ فانی، ہے کس کا قانونِ جاودانی
جو روز ہوتی ہے تجھ پہ طاری وہ مست ترکیبِ خواب کیا ہے؟

یہ کیوں درخشندہ ہیں کواکب یہ آسماں کیوں ہے گردشوں میں
ہے مہر میں التہاب کیسا، یہ نزہتِ ماہتاب کیا ہے؟
ہے چیستاں کارزارِ ہستی، مگر ہے ہر ذہن مائلِ حل
یہ کاوشِ بے شمار کیوں ہے وہ شورشِ بے حساب کیا ہے؟
نکل کے اجسام سے یہ روحیں کدھر چلی جا رہی ہیں لاکھوں
تعیّنِ روزِ حشر کیوں ہے، سیاستِ احتساب کیا ہے؟
تو محوِ سائنس و فلسفہ ہے حریمِ فطرت کا راز ہو کر
سمجھ حقیقت نظامِ ہستی کی بے نیازِ مجاز ہو کر

مجاز و حقیقت

صبح و شامِ جہانِ فنا پردہ ہے
رنگ و بو، تیرگی و نور و ضیا پردہ ہے
مختصر ذرۂ خاکی ہے حجابِ اکبر
وسعتِ انجمنِ ماہ و سُہا پردہ ہے
اور ہے مطرب و ساقی میں کوئی کیف صدا
نغمۂ و نالۂ و ہر ساز و نوا پردہ ہے
ہے اسی باطنِ ہستی میں حقیقت پنہاں
یعنی دنیا یہ تمام ایک سرا پردہ ہے
جلوہ گاہے دگر و لالہ ستانے دگر است
پسِ ایں پردۂ صد رنگ، جہانے دگر است

طور کی چوٹی پر

چمک اے برقِ عالم سوز، یہ پردہ کشی کیسی؟ تپش آلودۂ حسرت سے یہ ہم خاطری کیسی؟
حجابِ شرم اور وہ بھی نظر بازانِ معنیٰ سے ہوئی جب ملتفت اکبار تو پھر بے رخی کیسی؟
چمک کر تیرا چھپنا، جسنے دیکھا اُس نے دیکھا تھا ہمیں تو دیکھنا یہ ہے کہ تابش ہے تری کیسی؟
تری فطرت میں طوفانِ سرور و نور سُنتے ہیں تو پھر یہ طور پر تاریکی و افسردگی کیسی؟
کلیم اللہ پر کیا ختم تھا نطقِ کلیمانہ؟ یہ بزمِ عشق پر چھائی ہوئی ہے خامشی کیسی؟
وداعِ ہوش کی پروا نہ کر، جلوہ گری فرما ابھی ہی ہوش جب ہم میں نہیں پھر بیہشی کیسی؟
ہمیں بھی کر تپش اندوز اے برقِ شرار افگن کبھی ہم بھی تو دیکھیں تجھ میں ہے غارتگری کیسی؟

مثالِ ابنِ عمراں، طالبِ دیدار ہم بھی ہیں
جلا دے، خاک ہونے کیلئے تیار ہم بھی ہیں

یہ وادی، یہ بیاباں، اور یہ ایمن کی تنہائی امیدِ سوختن کس عالمِ حیرت میں لے آئی
یہ چوٹی طور کی جو یادگارِ عہدِ موسیٰؑ ہے کھُبی جاتی ہے آنکھوں میں بایں دیرینہ عنائی

نظر آتا نہیں میرے سوا نظارگی کوئی
کبھی میں خود تماشا ہوں، کبھی میں خود تماشائی

لگانا چاہتا ہوں سارے کوہِ طور کا سُرمہ
بڑھانا چاہتا ہوں دیدۂ حسرت کی بینائی

تمنّا ہے کہ اس منظر کو اپنے ساتھ لیجاؤں
مرے دامن کی تنگی دیکھ اور ایمن کی پہنائی

مری آوارہ کیشی حاملِ ذوقِ تجلّی ہے
نہ میں وحشی نہ دیوانہ، نہ سودائی نہ صحرائی

خرابِ حسن ہوں میں جسطرح چمکے جہاں چمکے
فدائی اک جھلک کا، ایک جلوے کا تمنائی

سوادِ یاس کی تاریکیٔ شبگیر چمکا دے
میں ہوں سرگشتۂ ظلمت مری تقدیر چمکا دے

کلیسا میں تجھے ڈھونڈا، حرم میں بھی تجھے ڈھونڈا
برہمن بنکے ہر بیت الصنم میں بھی تجھے ڈھونڈا

بہت کی دردمندوں کے دلوں میں جستجو تیری
حسینوں کی نگاہِ پُرستم میں بھی تجھے ڈھونڈا

وفا والوں کے سامانِ وفا میں بھی تجھے دیکھا
عطا والوں کے دامانِ کرم میں بھی تجھے ڈھونڈا

سُنے نغمے ہزاروں سب وہ لیکن تجھ سے خالی تھے
نوائے مطربہ کے زیر و بم میں بھی تجھے ڈھونڈا

لیا تیری طلب میں جائزہ سب کے خیالوں کا
نگارستانِ اربابِ قلم میں بھی تجھے ڈھونڈا

شریکِ عیش ہو کر، شاملِ بزمِ عزا ہو کر
خوشی میں بھی تجھے ڈھونڈا الم میں بھی تجھے ڈھونڈا

وفورِ جستجو نے کر دیا اس درجہ کاہیدہ
کہ دامانِ نسیمِ صبح دم میں بھی تجھے ڈھونڈا

بالآخر طور پر مجھ کو ہوائے آرزو لائی

بہ شکلِ مشرقِ رنگ و نوا اک جستجو لائی

چمک اے برقِ ایمن، اور جذبِ پا یک شرر کردے | لگی دل کی بجھا دے، آ مجھے شعلہ بسر کردے
نظر کی آرزو یہ ہے کہ ممنونِ تجلّی ہو، | تجلّی کو خدارا آج مشکورِ نظر کردے
زمانہ ہو چکا پھر طور کا ماحول خالی ہے | فضائے شوق میں خاکسترِ قلب و جگر کردے
بیک رنگینیِ تجلّی و بہ یک ضوریزیٔ تازہ | مرے طولِ امل کی داستاں بھی مختصر کردے
نگاہِ تشنہ میں بھر دے شرابِ حیرتِ جلوہ | خودی سے تنگ ہوں بے خود بنا دے بے خبر کردے
جمودِ طورِ سینا چاہتا ہے بے سکوں ہونا | جسے سُرمہ کیا تھا پھر اُسے زیر و زبر کردے
بصد انداز کر اندازِ رعنائی کو بے پردہ | مجھے ہم رنگِ موسیٰ آج کوہِ طور پر کردے

مرے سوزِ دروں سے جلوہ گاہِ نور پیدا کر
ہر اک ذرے سے میری خاک کے سو طور پیدا کر

حسن

"حسن" ہی اک رازِ فطرت، جو نہیں عریاں ہنوز		علم اسکا ہے خدا کے ذہن میں پنہاں ہنوز
حسن کے لاکھوں فسانے ہو گئے صرفِ قلم		گو حقیقت نے چھوا تک بھی نہیں عنواں ہنوز
حسن کی زلفوں سے ہے نیرنگیٔ شامِ ابد		حسن کی کرنوں سے ہی صبحِ ازل خنداں ہنوز
تو فنائے حسن بھی ممکن سمجھتا ہے۔ مگر		حسن ہے وجہ قیامِ عالمِ امکاں ہنوز
حسن نے ہر دور کو دی ہی بقائے جاوداں		اور تو فانی سمجھ کر اس کو ہے ناداں ہنوز

فطرتِ مطلق پہ غالب ہو قضا ممکن نہیں
حسن ہی فطرت ہی، فطرت کو فنا ممکن نہیں

باغ فانی ہے مگر، نفسِ نمو فانی نہیں		پھول فانی ہیں مگر پھولوں کی بُو فانی نہیں
آرزو رہتی ہی باقی، آرزومندوں کے بعد		دل فنا ہو گئیں ہی، دل کی آرزو فانی نہیں
چند قطروں کے تموّج سے نہیں کچھ آبرو		خشک ہونے پر بھی شانِ آبجو، فانی نہیں
جستجو کا سلسلہ ہی کارواں در کارواں		راستے فانی ہیں، ذوقِ جستجو فانی نہیں

"روح" سے ہی "تُو" عبارت، روح ہی عینِ بقا　　　تیرا پیکر ہے فنا بردوش، "تُو" فانی نہیں

موت اس کے پاس ہو کر بھی گذر سکتی نہیں
یعنی فطرت راز بن سکتی ہے مر سکتی نہیں

حُسن جس پیکر میں اپنی جلوہ ارزانی کرے　　　اُس سے کہدو، اس امانت کی نگہبانی کرے
حُسن کو فانی سمجھ کر ہو نہ اس سے بے نیاز　　　اور تدبیرِ بقائے ہستیٔ فانی کرے
حُسن کے پرتو سے بن کر ایک صبحِ نور بار　　　ہو سکے تو سارے عالم میں درخشانی کرے
اے امینِ حُسن، قدرِ حُسن کرنی چاہئے　　　ہے وہی یوسفؑ جو سعیِ پاک دامانی کرے
کر یقیں، اپنا نشیمن حُسن کو یاد آ گیا　　　پیکرِ فانی سے جب عزمِ پرافشانی کرے

آمد و شد سے مسلسل گرمِ راہِ حُسن ہے
حُسن لافانی ہے، فانی سیر گاہِ حُسن ہے

شاعرِ امروز

ہوشیار اے شاعرِ شیوہ بیاں، نازک خیال
ہے گرفتِ پنجۂ تنقید میں تیرا کمال؟

آ میں دیکھوں، کیا ترا سرمایۂ افکار ہے؟
آ میں پرکھوں شاعری کا تیری کیا معیار ہے؟

اے کہ تو تقلید کے دھوکے میں ہے آیا ہوا
دل ہے تیرا ظلمتوں میں پرورش پایا ہوا

ہے قدامت کا بھنور گھیرے ہوئے تیرا دماغ
تو ابھی چقماق سے اپنا جلاتا ہے چراغ

ہے نہیں تیری نقوشِ نو سے مصروفِ گریز
کاروانِ رفتہ کے دھندلے قدم پر سجدہ ریز

عہدِ برقی میں تو اب تک شمع کا پروانہ ہے
ایک فرضی قمقمہ تیرا چراغِ خانہ ہے

اُڑ چکا بلبل بہت مدت ہوئی ایران سے
روپ میں اُس کے چہکتا ہے تو ہر عنوان سے

تو کبھی صیاد کے دامِ بلا کا ہے شکار
اور کبھی ہے گھونسلے میں سرخوشِ فصلِ بہار

رنگ و بو کی دلفریبی میں گھرا رہتا ہے تو
آدمی کے بھیس میں طائر بنا رہتا ہے تو

قبر لیلےٰ، گورِ مجنوں ہو چکے جزوِ زمیں،
تو سمجھتا ہے انہیں صحرا کمیں، محمل نشیں

کوہکن کی لاش، تیرے سامنے ہے بے کفن
کھودتا ہے تو گڑے مُردے ابھی اے گورکن!

انقلاب آئے کئی دنیا کی صبح و شام میں
تو ابھی ہے محو ہجر و وصل کے اوہام میں

تو بھی ہے ناکام، تیری فکر بھی ناکام ہے — سچ بتا اس شاعری کا تیری کیا انجام ہے؟

باش، اے کذاب اے بہروپیے، باطل پرست — میں ترے پندار کو دیتا ہوں پیغامِ شکست

آ، ادھر آ، کھول آنکھیں سامنے ہے آئینہ — دیکھ اس میں رنگ اپنے ملک کا اور قوم کا

کیا کبھی لکھا ہے تو نے ان پہ کوئی مرثیہ؟ — کیا ہوا ہے تو کبھی ان کے لئے نوحہ سرا؟

کیا ہے کوئی شعر تیرا، ترجمانِ دردِ قوم؟ — تو نے کیا منظوم کی ہے داستانِ دردِ قوم؟

تو کبھی محفل میں آیا ہے رجز گاتا ہوا! — گونجتا، روتا، گرجتا، آگ برساتا ہوا؟

اپنے سوزِ دل سے گرمایا ہے سینوں کو کبھی؟ — تر کیا ہے آنسوؤں سے آستینوں کو کبھی؟

دردِ ملت کی کبھی سینے پہ برچھی کھائی ہے؟ — چاندنی راتوں میں بیداری کی لذت پائی ہے؟

قوم کے غم میں کیا ہے خون کو پانی کبھی؟ — رہگذارِ جنگ میں کی ہے حدی خوانی کبھی؟

حشر اٹھایا ہے کبھی اک نغمۂ بیتاب سے؟ — کیا ربابِ دل کو چھیڑا ہے کبھی مضراب سے؟

کیا کوئی مطلع کہا ہے قابلِ شانِ وطن؟ — کیا کوئی تشبیب سوچی ہے بعنوانِ وطن؟

کیا رلایا ہے لہو تو نے کسی مضمون سے؟ — نظمِ "آزادی" کبھی لکھی ہے اپنے خون سے؟

کیا کسی کا دل پسیجا ہے ترے افکار سے؟ — کیا کبھی شعلے تراشے ہیں لبِ گفتار سے؟

اے پرستارِ قدامت، عبرتِ ننگِ سخن ، بیٹھ نقالوں کی صف میں، چھوڑ اورنگِ سخن؟

میں ترے بہکے ہوئے جذبات کا قائل نہیں صاف کہتا ہوں کہ یہ مسند ترے قابل نہیں

شاعری پیغمبری کا جزو کہتے ہیں سب جسے کیا ملا ہے اس میں کوئی واقعی حصہ تجھے؟

کیا قیودِ مکتبی کو ترک کر دیتا ہے تو؟ کیا کبھی بے فکر کے بھی شعر کہہ لیتا ہے تو؟

دردآلودہ جو لب تک شعر آتا ہے کبھی ٹھیس سے اُس کی ترا دل چوٹ کھاتا ہے کبھی؟

کیا براہِ راست تو ہے عرش سے الہام کوش؟ کیا تجھے پچھلے پہر آتی ہے آوازِ سروش؟

کیا چھڑکتا ہے کوئی کوثر ترے انفاس پر؟ کیف کی ہوتی ہے کیا بارش ترے احساس پر؟

کیا میسر ہیں تجھے انگڑائیاں تخئیل کی؟ کیا صدا تو نے سُنی ہے شہپرِ جبریلؑ کی؟

کیا کبھی باطل سے حق کی تو نے کی ہے جستجو؟ کیا رگِ گُل سے ترے دامن میں ٹپکا ہے لہو؟

کیا کبھی بدلی میں دیکھے ہیں ستارے ضوفشاں خاک سے بھی کیا کبھی چمکی ہیں تجھ پر بجلیاں؟

شام کی تصویر کھینچی ہے سحر کے نور سے؟ تجھ کو آئی ہے کبھی بوئے کفن کافور سے؟

چاند کی کرنوں سے کیا تو ہو چکا ہے ہمکلام؟ ساغرِ خورشید میں پی ہے شرابِ لالہ فام؟

لرزشِ شبنم سے پھولوں کے ورق پر تو نے کیا؟ طرح کا مصرع کوئی دیکھا کبھی لکھا ہوا؟

سوزِ دل کا تازہ کلیوں سے کیا ہے اکتساب؟ آگ سے تو نے نچوڑا ہے کبھی عطرِ گلاب؟

پردۂ اسرار کی محرم ہے کیا تیری نگاہ؟ — کیا نظر آتی ہے ہر ذرّے میں تجھکو ایک اہ؟
کیا حقیقت سے ہوا ہی آشنا تیرا مجاز؟ — کیا پڑہی ہے تونے چوکھٹ پر شوالے کی نماز؟
کیا وضو تونے کیا ہے بادۂ سرجوش سے؟ — لی ہے کیا تعلیم پتھر کے لب خاموش سے؟
کیا کبھی اُٹھا ہی تیری مجمر دل سے دُہواں؟ — شعر خیز و نغمہ ریز و نطق بیز و نظم خواں؟
شعر کی لذت سی ہو جاتا ہے تو مجروح کیا؟ — شعر کہنے سے تڑپ جاتی ہی تیری روح کیا؟

اے سخن دشمن اگر حاصل نہیں یہ مرتبہ — خون کیوں کرتا ہی پھر بکواس سی الفاظ کا

درد کا حامل نہیں اسرار کا ماہر نہیں
آج میں اعلان کرتا ہوں کہ تو شاعر نہیں

اساسِ کائنات

بیخودی میں کل کسی آزاد نے کہدی یہ بات ہے محبت ہی سے پردہ دارئ رازِ حیات

ہیں یہ دونوں آبِ رنگِ مہر سے سینچی ہوئی سبزہ زاروں کی سحر ہو یاسمن زاروں کی رات

ہے محبت برہمئ دہر کو روکے ہوئے ورنہ تھا اس کا اُلٹنا از قبیلِ ممکنات

ہیں اسی سے بزمِ کیف و وجد کی سرمستیاں اور ہے قیدِ الم میں ہر نفس اس کا نجات

عشق کی گرمی اسی سے اخذ کرتی ہے سکوں حُسن کی نظروں کو یہ دیتی ہے رنگِ التفات

ہو کوئی گمنام، یا مزدور، یا صحرا نشیں مرحمت کرتی ہے سب کی زندگی کو اک ثبات

ہے اسی سے روح پرور نغمۂ نے کی صدا انجمن میں ہے یہ مضرابِ ربابِ حیات

مُو قلم میں کارفرما ہے مصوّر کے یہی ذہنِ شاعر میں اسی سے ہے نزولِ واردات

عالمِ ہستی کی یہ مضبوط اک بنیاد ہے یعنی قائم ہے محبت پر اساسِ کائنات

مرحبا بر جانِ او، صد سجدہ ہا بر نامِ او

او خدائے ماست و ما بندۂ بے دامِ او

میری ہستی

اپنی ہر رگ میں شرارِ آرزو رکھتا ہوں میں
برق سے بہتر مذاقِ جستجو رکھتا ہوں میں

سرخوشی کونین کی میرے ہی میخانے سے ہے
مذہبِ پیمانہ و جام و سبو رکھتا ہوں میں

میرے اوراقِ پریشاں کو حقارت سے نہ دیکھ
ہر ورق میں اک جہانِ رنگ و بو رکھتا ہوں میں

میں نمازِ شام پڑھ سکتا ہوں سطحِ بحر پہ
نیل میں بھی ہمتِ غسل و وضو رکھتا ہوں میں

میں وہ ہی قطرہ ہوں جو ہے جاذبِ کُل کائنات
وسعتِ قلزم کو رہنِ آب جو رکھتا ہوں میں

روح میری ہے شناور، دل مرا طوفاں شناس
موجِ کوثر سے زیادہ آبرو رکھتا ہوں میں

بسکہ میرے سامنے ہے جلوہ گاہِ شش جہات
بزمِ عالم میں نگاہیں چار سو رکھتا ہوں میں

ہے مجھے سیرِ دو عالم پر مجالِ اختیار
آئینہ دل کا ہمیشہ روبرو رکھتا ہوں میں

ہو گئے ہیں چاک لاکھوں میری دامن میں تو کیا
ہر نظر میں قوتِ تار رفو رکھتا ہوں میں

آبگینوں میں مری آنکھوں کے ہے عطرِ بہار
جذب ان میں لالہ و گل کا لہو رکھتا ہوں میں

میرا مٹ جانا بھی ہے سیمابؔ میری زندگی
اپنی خاکستر میں سامانِ نمو رکھتا ہوں میں

(ایک تصویر دیکھ کر)

یہ کون خلوت کدے کے پردے الٹ کے جلوے دکھا رہا ہے؟
یہ کس کا، کافر شبابِ رنگیں، شفق کے خاکے اڑا رہا ہے؟
یہ کس کے ہنگامۂ تصور سے، ہے خموشی فضا میں طاری؟
خیال کی قوتوں سے یہ کون دل کی دنیا ہلا رہا ہے؟
یہ کس کی آرائشوں نے جنت کی ایک تصویر کھینچ دی ہے؟
بہارِ رنگ و سرور بن کر یہ کون منظر پہ چھا رہا ہے؟
مجسّم اک پیکرِ تجلّی، پھر اس پہ شرم و حیا کا زیور؟
برس رہی ہے بھری جوانی، شباب موجوں پہ آ رہا ہے؟

نہ کوئی غمّاز و نکتہ چیں ہے
نہ کوئی ہمراز و ہم نشیں ہے

سکون کی انتہا نہیں ہے
کسی کی آواز بھی کہیں ہے؟
مگر کسی کا خیال دل کی زبان سے کچھ سنا رہا ہے
حسین دیوی یہ پریم کی ہے، یہ پریت کرتی ہے دل لگا کر
پیا کی دھن پریم کی لگن میں، خموش بیٹھی ہے سر جھکا کر
یہ نامۂ شوق و آرزو میں شکایتیں غم کی لکھ رہی ہے
گذارشِ حال کر رہی ہے وفورِ جذبات کو دبا کر
جھکی ہوئی ہیں نشیلی آنکھیں، لڑی ہوئی ہیں قلم سے نظریں
ردا جو سر سے ڈھلک گئی ہے رکی ہے دوشِ حسیں پہ آکر
ہے غرقِ محویتِ تخیل، نہیں ہے ہوش اپنے تن بدن کا
کہ خود ہی کاغذ پہ بہہ رہی ہے روانیٔ فکر میں سما کر
تکلم اس کی نظر سے عریاں
تبسم اس کے لبوں میں پنہاں
جبیں سے شانِ فادرِ خشاں
نظر سے تمکنت نمایاں

کسی سے در پردہ گفتگو ہے کسی کو پیغام جا رہا ہے
یہ دستِ نازک سے لکھ رہی ہے کسی کو ذوقِ وفا کی باتیں
قلم سے اس کے ٹپک رہی ہیں، طلب کی بوندیں حیا کی باتیں
یہ لکھ رہی ہے کہ "تم تو جاتے ہی پریم داسی کو بھول بیٹھے"
"وہ شامِ رنگیں کے عہد و پیماں، بہار و ابر و ہوا کی، باتیں"
یہ لکھ رہی ہے کہ "منتظر ہیں تمہارے حسنِ قدوم کی ہوں"
"پیام آمد کا روز دیتی ہے۔ ہائے بادِ صبا کی باتیں"
یہ لکھ رہی ہے کہ "ہم تو بے چین رات دن غم میں ہیں تمہارے"
"تمھیں بھی ہیں یاد یا نہیں ہم؟ خدا ہی جانے خدا کی باتیں"

وہ راحتیں ہوگئیں کہانی
اُداس رہنے لگی جوانی
تمھیں سے ہے میری شادمانی
تمھیں تو ہو وجہِ زندگانی

تمھیں صدا دے رہی ہے کوئل تمھیں پپیہا بلا رہا ہے

شاعر کا نصب العین

جب روح محوِ خواب ہو، جب خواب سکر آمیز ہو
جب ہو جمود آگیں فضا، غفلت کی مستی تیز ہو

جب محفلِ افراد میں ہو انتشار مستقل،
جب شورشِ ایام کی ہر موج طوفاں خیز ہو

پھیلی ہوئی ہو جب وبا دُنیا میں استبداد کی
جب ہر نفس ہو مضطرب، ہر آنکھ اشک انگیز ہو

جب نشترِ احساس خود دل کی رگوں کو چھیڑ دے
جب خاطرِ مجروح کا ہر ساغر خوں ریز ہو

جب آدمی مظلوم ہو اور زندگی مظلوم تر
جب بیکسی کے سامنے فرعون ہو چنگیز ہو

اُس وقت شاعر سے کہو تخئیل کو تکلیف دے
اجزائے نظم و شعر کو پیرایۂ تصنیف دے

شاعر کا فطری فرض ہے دے رفعتیں جذبات کو
تبدیل کر دے صبح میں تاریکیٔ ظلمات کو

پھولوں کے دل میں کھول دے بادِ چمن کی راستے
ہموار کر دے دشت میں بکھرے ہوئے ذرات کو

رشتے فنا کے جوڑ دے سر چشمۂ جاوید سے
رنگِ حیاتِ تازہ دے دُنیائے محسوسات کو

نغموں سے اپنے پھونک دے پژمردگی میں تازگی
تجدید کا پیغام دے، مایوسیٔ حالات کو

اُٹھے اور اپنی مشعلِ تحقیق کو کر دے بلند
جب حادثوں کے خوف سے تھرائیں تاریکات کو

چھا جائے انساں زار پر صبحِ نگاریں کی طرح
برسے دلِ بیدار پر الہامِ رنگیں کی طرح

شاعر کے نصب العین ہیں، تہذیبِ عالم عام ہے   ہر شعر اُس کا وحی ہے۔ ہر اک نوا الہام ہے
شاعر کے نصب العین ہیں، عزمِ الٰہی ہیں نہاں   اُسکے قلم کی ہر صدا، فطرت کا اک پیغام ہے
شاعر کے نصب العین ہیں، عرفاں کی موجیں ہیں بلند   آغاز اس کی فکر کا آئینۂ انجام ہے
شاعر کے نصب العین ہیں، ہے کامیابی خلق کی   مقصد میں اپنے اس لئے وہ فطرتاً ناکام ہے
شاعر کے نصب العین ہیں، ہیں دو جہاں کی وسعتیں   نظروں میں صبحِ عرش ہے تحت الثریٰ کی شام ہے

پیدا ہوا ہے خلق کی مشکل کشائی کے لئے
شاعر ہے "آوازِ خدا" ساری خدائی کے لئے

شاعر کا نصب العین ہرگز ایک ہو سکتا نہیں   وہ رندِ کامل ہے کہیں، اور مصلحِ اعظم کہیں
جب مست ہے، تو ہمنشیں اُسکا ہے ساقیِ ازل   جب ہوش میں ہے۔ محفلِ مستی کا ہے مسند نشیں
مجذوب ہے۔ تو ہے حقیقت فاش اسکے جذب سے   سالک ہے وہ، تو ہے چراغِ راہِ اربابِ یقیں
قائد بھی ہے مرشد بھی ہے عابد بھی ہے زاہد بھی ہے   کثرت میں لا محدود ہے۔ وحدت میں ہے خلوت گزیں
وہ حُسن کا شاہد بھی ہے اور عشق کا مشہود بھی   ساجد بھی ہے مسجود بھی۔ گاہے چناں گاہے چنیں

جو کچھ ہے۔ جیسا ہے۔ جہاں ہے۔ حاصلِ کونین ہے

فطرت کا نصب العین گویا اُسکا نصب العین ہے؟

عشرت کدہ میں نغمۂ شاعر اگر نوروز ہے
ماتم کدہ میں اُسکا اک آنسو جہان سوز ہے

وہ آخری مقصد ہے سرد و گرمِ رزم و بزم کا
وہ رونق ایواں ہے۔ ہر میدان میں فیروز ہے

صبحِ الٰہیات کا خورشید ہے نور آفریں
شامِ سیاسیات کی وہ شمعِ شب افروز ہے

اصنافِ نفسیّات میں ایسا کوئی ماہر نہیں
درسِ طبیّات میں ہر جہاں آموز ہے

مردِ تصور ہی نہیں کامل مصوّر بھی ہے وہ
فی کلِّ وادی میں اسی کا ذکرِ خیر اندوز ہے

قسمت ہوئی تخئیل کی آوارہ تقدیری اُسے
فطرت نے خود تفویض کی شانِ ہمہ گیری اُسے

جس وقت کوئی ساربان عذرِ سبک رانی کرے
اُس وقت شاعر سے کہو آ کے حدی خوانی کرے

جب جادۂ اقوام میں دشواریاں ہوں سدِّ راہ
اُس وقت شاعر سے کہو تدبیرِ آسانی کرے

جب گردِ فکر و یاس میں چھپ جائے سارا قافلہ
اُس وقت شاعر سے کہو سعیِ درخشانی کرے

جب شورشوں کے بعد بھی ممکن ہوا اک انقلاب
اُس وقت شاعر سے کہو خونِ جگر پانی کرے

جب ایک بھی آنسو نہ چشمِ خلق میں باقی رہے
اُس وقت شاعر سے کہو اک نالۂ ارزانی کرے

شاعر کو ہر بے چین دل کا چین ہونا چاہیئے
اب تک نہیں۔ تو اب یہ نصب العین ہونا چاہیئے

آئینۂ افق

اکثر افسردہ کیا دعوتِ حرماں سے مجھے — شکوہ ہے اپنے تماشائے پریشاں سے مجھے
کیا خبر سینے میں پیوست ہیں کتنے نشتر؟ — خون رِستا نظر آتا ہے رگِ جاں سے مجھے
پھول سے ملتی ہے اک تلخ شرابِ انجام — پھانس ہوتی ہے عطا خارِ بیاباں سے مجھے
بیخودی میں جو کبھی میں نے جھکا لیں نظریں — موت نے چھیڑ دیا گورِ غریباں سے مجھے
سر اُٹھایا تو نیا عالمِ عبرت دیکھا — کچھ ہیولے نظر آنے لگے ویراں سے مجھے

ہے بصیرت پہ حجابِ در و بام آئینہ — دیکھتا ہوں کہ یہ عالم ہے تمام آئینہ

زیرِ دامانِ افق، آہ یہ دھندلے سے نشاں — جنھیں سورج کی شعاعوں نے کیا ہے عریاں
کہیں مینار شکستہ کہیں گنبد بہ باد — خوف سے اُڑ نہیں سکتا کوئی طائر بھی یہاں

رات کا ایک وہ حصّہ جو سحر تک ہو سیاہ — ایک "انبار اندھیرے کا" مہیب و ویراں
شاید اس بزم کی سب ہو گئیں شمعیں خاموش — کہیں ادبار کے بادل، کہیں حسرت کا دھواں
زندگی کی نہیں ضو ریز کہیں چنگاری — صرف ہے راکھ کا اک ڈھیر فضا میں لرزاں
جو مسرّت کی محل عیش کا گھر بنتے ہیں — اُنھیں ایوانوں سے دنیا میں کھنڈر بنتے ہیں

مری ہستی نہ ہو کچھ بھی، مگر اے خالقِ ہستی
حقیقت کیوں نہ تجھ پر کھول دوں دنیائے فانی کی؟

حریصِ اس درجہ فطرت کیوں ہوئی تخلیقِ انساں پر
نہ تھی جب خود ہوس اس کو نشاطِ زندگانی کی

یہ بحرِ آفرینش کا ستم ہے یا عنایت ہے
کہ طوفانوں میں آکر گھر گئی اک بوند پانی کی

مری مجبوریاں دیکھ اور جبر و اختیار اپنا
بہت صبر آزما ہے آزمائش بے زبانی کی

تجھے یہ فکر پھر محفل میں تیری لوٹ آؤں میں
مجھے با ایں ہمہ حسرت حیاتِ جاودانی کی

چو لذّت آشنائے جرعۂ آبِ بقا کردی
زیک جامِ بقا لب تشنۂ صد میکدہ کردی

نظامِ ناقصِ تخلیق کی تکمیل ہو جاتی
اگر انسان دنیا میں نہ مجبورِ فنا ہوتا

مجسّم ہو کے ملتی باریابی تیری محفل میں
ملا تھا روح کو پیکر تو کیوں اس سے جدا ہوتا

چلا آتا کسی ترکیب سے دنیا کو سمجھا کر
نہ یہ شورِ فغاں ہوتا نہ یہ ماتم بپا ہوتا

ہم اک لمحے میں مثلِ روح تیری پاس آ جاتے
زمیں تک عرش سے اک نور کا جھولا پڑا ہوتا

زمیں کیوں بار سے اجسام کے ہوتی پراگندہ　　فلک کیوں دیکھ کر یہ سانحے نوحہ سرا ہوتا

غلط راہیست راہ گور پیش کاروانِ تو
فنا با جانِ او ہرگز نمی ارزد بجانِ تو

نہ ہو گر تو خفا، تو آج میں یہ بات بھی کہہ دوں　　زوالِ ہستیٔ انساں کمالِ نقصِ ہستی ہے
نہ ہو کیوں موت پر قادر جو قادر زندگی پر ہو　　طرازِ خلق پر ذہنیتِ مخلوق ہنستی ہے
ہو کوئی برہمن، مقصود تیرے پاس آنا ہو　　نظر بزمِ ازل کی سیر کو سب کی ترستی ہے
وہ اک قانون جس سے موت کا سا خوف طاری ہو　　خلافِ دلنوازی جذبۂ قوت پرستی ہے
زمیں پر عرش سے آنا زمیں سے قبر تک جانا　　یقیناً موت بعدِ موت ہستی بعدِ پستی ہے

شکایت نقصِ ہستی می کند، عزمِ تلافی کن
قوانینِ فنا را جذبِ الطافِ اضافی کن

دلِ کی پیاس

اُس نے آباد کیا عالمِ امکاں میں مجھے
اور اک دل بھی دیا، سینۂ سوزاں میں مجھے

دل میں احساس دیا، چین نہ لینے والا
کر دیا جذبِ اس احساسِ پریشاں میں مجھے

میں نے دیکھا گلِ رنگیں کو چمن میں بدمست
سبزہ سرخوش نظر آیا، چمنستاں میں مجھے

چاند کو نورِ تبسم سے درخشاں دیکھا
صبح صد رنگ ملی، جوشِ بہاراں میں مجھے

جنھیں احساسِ مسرت نہیں وہ وحشی بھی
چوکڑی بھرتے نظر آئے بیاباں میں مجھے

آہ لیکن مجھے یہ کیف ودیعت نہ ہوا
میرے دل کو کبھی احساسِ مسرت نہ ہوا

دل شگفتہ نہ ہوا جوشِ مسرت سے کبھی
کاہشِ غم نہ مٹی، میری طبیعت سے کبھی

مسکراتی ہوئی آئی نہ خوشی کی تنویر،
نور چمکا نہ مرے گوشۂ خلوت سے کبھی

مجھے دونوں نے سبکبارِ تمنا نہ کیا
بھیک مانگی کبھی وحشت سے محبت سے کبھی

سوز ہی سوز میں گذری مری عمرِ فانی
ساز نے لاگ نہ کھائی مری فطرت سے کبھی

تشنہ تقدیر وہ ہوں میکدۂ ہستی میں — کہ نہ مخمور ہوا بادۂ عشرت سے کبھی

جب سرِ میکدہ تقسیم خوشی ہوتی تھی

کیا خبر ہے، مری تقدیر کہاں سوتی تھی؟

یوں جھلکتی ہے خوشی، خاطرِ ویراں میں کبھی — جیسے اک شمع جلے گورِ غریباں میں کبھی

چبھتی رہتی ہے کوئی چیز بطورِ نشتر — ورقِ دل میں کبھی، سازِ رگِ جاں میں کبھی

زندگی کی یونہی ہوتی رہیں راتیں کالی — خوابِ حرماں میں کبھی خوابِ پریشاں میں کبھی

بن گئی فطرت افسردہ حجاب ہر رنگ — دل شگفتہ نہ ہوا صحنِ گلستاں میں کبھی

یہی عالم ہے تو کیا یاد کریں گے ہم بھی — کہ گراں سیر تھے، غمخانۂ دوراں میں کبھی

ذوقِ مستی نہ مذاقِ مے و پیمانہ ملا،

فطرتِ شمع ملی مشربِ پروانہ ملا،

فطرتاً شعلۂ جولانِ محبت ہوں میں — نسبتاً اس لئے محرومِ مسرت ہوں میں

عشق کی آگ ازل سے ہے فروزاں دل میں — ایک آتش کدۂ سوختہ فطرت ہوں میں

حسن اگر چاہے تو آساں ہے مری چارہ گری — گو ہوں بیمار، مگر قابلِ صحت ہوں میں

میرے ساقی کو یہ پیغام کوئی دے میرا — تشنۂ یک نظرِ مہر و مروت ہوں میں

تو اگر چاہے تو ممکن ہے حفاظت اب بھی — صورتِ شمعِ سحر مائلِ رخصت ہوں میں

بجھ گیا میں تو ہے رسوائیِ فطرت تیری
عالمِ روح میں گونجے گی شکایت تیری

جب یہ سنتا ہوں کہ تنہائی ہی ملجائے سکوں — دشت و کہسار سے کرتا ہوں تمنائے سکوں
جب یہ سنتا ہوں کہ ہے حسن خدائے تسکیں — قدمِ حسن پہ جھکتا ہوں بہ سودائے سکوں
جب یہ سنتا ہوں، بصیرت میں ہیں انوارِ شکیب — چھپ کے ہر ذرے میں کرتا ہوں تماشائے سکوں
جب یہ سنتا ہوں، کہ فطرت کی مناظر میں ہے کیف — عالمِ رنگ میں پھرتا ہوں میں جویائے سکوں
آہ لیکن ہے وہی تیرگیِ خلوتِ غم — نہ تجلیِ مسرت، نہ تجلائے سکوں

دعوتِ کیف، توقع سے فزوں دے مجھ کو
ہے کوئی آج کہ پیغامِ سکوں دے مجھ کو؟

ہم برق کے زندہ ٹکڑے ہیں، ہم جنّت کے پروانے ہیں
لبریز شرابِ فطرت سے بے گردش کے پیمانے ہیں

ہم جلوے ہیں اور خود اپنے جلوے شب بھر چمکاتے ہیں
ہم نغمے ہیں، اور خود اپنے معصوم ترانے گاتے ہیں

تخلیق ہماری نور سے ہے، ترکیب آب و کافور سے ہے
ہر وقت تعلق روحانی اک میکدۂ مستور سے ہے

کچھ بھیگی بھیگی آوازیں الہام کدے سے آتی ہیں
گرتے ہی ہمارے ہونٹوں پر شیریں نغمے بن جاتی ہیں

ہم اپنے شیریں نغموں سے برساتے ہیں بیداری سی
بہنے لگتی ہے دنیا کے ایوانوں پر سرشاری سی

مضرابِ نگاہِ فطرت ہے، مہتاب ربابِ زریں ہے

ان نغموں کی بوچھاروں سے یہ سازِ ہستی رنگیں ہے

اے دنیا کے رہنے والو، تم کیوں مغموم پستی ہو
ہم بھی اُس کی آبادی ہیں تم جس دنیا کی بستی ہو
تم میں ہم میں کچھ فرق نہیں، مخلوق خدا کی دونوں ہیں
وابستہ ایک ہی رشتے سے یہ نوری خاکی دونوں ہیں
ہاں فرق اگر ہے تو اتنا، ہم ہنستے ہیں تم روتے ہو
ہم جاگتے رہتے ہیں شب بھر، تم غافل ہو کر سوتے ہو
ہاں فرق اگر ہے تو اتنا، ہم روحانی گہوارے ہیں
ملفوف تکدّر میں تم ہو، ہم نزہت کے فوّارے ہیں
ہاں فرق اگر ہے تو اتنا، تم اپنی حقیقت بھول گئے
ہم اپنی حقیقت پہچانے، باطل کی لعنت بھول گئے
ہاں فرق اگر ہے تو اتنا، ہم بے خود ہیں خوددار ہو تم
ہم مست جمالِ عرفاں سے اور بدمستِ پندار ہو تم
ہاں فرق اگر ہے تو اتنا، تم غافل ہو بیدار ہیں ہم

اُس نشّئے سے محروم ہو تم، جس نشّئے سے سرشار ہیں ہم
جو نورِ حقیقت ہم میں ہے وہ تم میں بھی تابندہ ہے
لیکن ہے تمہارہ دل مردہ اور روح ہماری زندہ ہے

جب رات کا سنّاٹا سطحِ عالم پر طاری ہوتا ہے
تخلیقِ غفلت کا فرمانِ مُہلک جاری ہوتا ہے
تاریک شعاعیں شعلوں سے دوزخ کے نکالی جاتی ہیں
اس تاریکی سے غفلت کی زنجیریں ڈھالی جاتی ہیں
پھیلایا جاتا ہے اُن کو پھر ہستی کے میدانوں پہ
پھینکا جاتا ہے پھر ان کو عشرت اندوز ایوانوں پر
انسان شعاعِ نور سمجھ کر راحت میں کھو جاتا ہے
نادان مقیّد خود ہی ان زنجیروں میں ہو جاتا ہے
عشرت جس کو یہ سمجھا ہے وہ موت ہے غافل انساں کی
تن آسانی کی ظلمت میں لُٹتی ہے محفل انساں کی

تم رات کو اے دنیا والو فکرِ راحت میں مرتے ہو
یوں ضائع آدھی عمر اپنی اک خوابِ گراں میں کرتے ہو
ہم اپنے روشن گیتوں سے جب رات جگانے آتے ہیں
آغوشِ اجل میں خوابیدہ ساری دُنیا کو پاتے ہیں
تم سُن نہیں سکتے وہ نغمے جن سے غفلت شرماتی ہے
جب اُن کی آگ برستی ہے ساری ہستی تھرّاتی ہے
ہم روح کی مستی سے بھر کر پیمانے اپنے لاتے ہیں
پیغام سکونِ ہستی کا انسان کو دینے آتے ہیں

اے غافل انساں جاگ کبھی، ہم سے فیضِ روحانی لے
جانِ محزوں کی تسکیں لے، غمگیں دل کی تابانی لے
اے غافل انساں جاگ کبھی، بے مانگے دولت لُٹتی ہے
تو وقت گنواتا ہے سوکر اور شب بھر نعمت لُٹتی ہے
اے غافل انساں دیکھ کبھی، پچھلے کو کیا کچھ ہوتا ہے
فطرت ملنے کو آتی ہے، اور تو بے پروا سوتا ہے

اے غافل انساں سوچ کبھی، یہ راز نہیں آئینا ہے
وہ موت کو خود کیوں دعوت دے، جسکو دنیا میں جینا ہے
یہ گیت ہے، وحیٔ عرشِ خدا، الہام کی صوتِ راز ہی یہ
جس ساز کا تو اک پردہ ہے اُس کی رنگیں آواز ہی یہ

بچمن در آ

دیکھ وقتِ صبح گلہائے شگفتہ کی شفق
آئینہ ہے بزم فطرت کا ہر اک رنگیں ورق
دیکھ کلیوں کی صبوحی میں شرابِ لالہ فام
صبح کے رنگوں سے اُسکے ڈہالنے کا اہتمام
دیکھ پھولوں کی رگوں میں زندگی چڑہتی ہوئی
قوتِ بالیدگی سے تازگی بڑہتی ہوئی
دیکھ کلیوں کی تُنک تابی سے رس بہتا ہوا
نورِ فطرت آشیاں سے تا قفس بہتا ہوا
دیکھ اس رنگین خاموشی میں جوشِ گفتگو
نغمۂ شبنم سے پیدا گرمیٔ آوازِ ہُو
دیکھ شاخوں میں خمِ محرابِ طاعت کی ادا
جھوم کر ہر بار جھکنے میں محبت کی ادا
دیکھ بزمِ رنگ و بُو کو غور کی نظروں سے دیکھ
کیا عیاں ہوتا ہے ان مہکے ہوئے جلووں سے دیکھ
اکتسابِ کیف کر کے اس تجلّی زار سے
قلب کو معمور کر لے دولتِ اسرار سے

شاعر اور سروش

بہت تجلی رات، یہ تاریک عالمِ خاموش
فلک سے تا بہ زمیں یہ تجلیات کا جوش

ہے بزمِ قلب سے اک راہ عرش تک پیدا
بھری ہوئی ہے سکوں سے خیال کی آغوش

یہ چاند اور یہ تارے، نشانِ منزلِ دوست
یہ کیف اور یہ سکون، خضرِ منزل کوش

پلائی ساقیٔ شب نے تند و تیز ایسی
نشاطِ خواب سے سارا جہان ہوا مدہوش

اب اُسکا بار ہے تکلیفِ دوشِ سجّادہ
"امامِ شہر کہ سجّادہ می کشید بدوش"

ہے کائنات میں بیدار صرف اک شاعر
"کہ ہست گوشِ دلش محرمِ پیامِ سروش"

بصد نیاز درِ دل پہ ہے نظر مسجود،
"ہزار گونہ سخن بر دہان و لب خاموش"

حریمِ عرش پہ ارمانِ جبہ سائی ہے
بلندِ فکر کا پیمانہ گدائی ہے

ہوئی ہے بارشِ الہام، قلب پر اس کے
ہے اُس کا دیکھنا سُننا بغیرِ دیدہ و گوش

براہِ راست مخاطب ہے اس سے ہاتفِ غیب
"مکن بہ عشق مباہات و زہد ہم مفروش"

صدائیں کان میں یہ آرہی ہیں صاف اُس کے
"چو قربِ او طلبی در صفائے نیّت کوش"

صفائے قلب سے یہ ہے تہیّہ شاعر
"بُروئے یار بنوشیم و بانگِ نوشا نوش"

"ببانگِ چنگ بگوئیم آں حکایتہا"
"کہ از نہفتن او دیگ سینہ میزد جوش"

وہ راز کھول دوں، جو مجھ پہ فاش ہیں اس وقت
خموش تا بہ کجا، چھیڑ دوں فسانۂ دوش

اسی خیال میں ہوتے ہیں صبح کے آثار
محیط دہر سے اُٹھتا ہے ایک سیلِ خروش

وہ جبر کر کے سکوت اختیار کرتا ہے
سکونِ وقت کا پھر انتظار کرتا ہے

نوروز

عشرت کا فریب، عشرت آموز ہے آج
ورنہ کل تک جو تھا، وہی سوز ہے آج

جس دن کوئی کام تجھ سے ہو جائے نیا
اُس روز یقین کر کہ نوروز ہے آج

خورشید، خیالِ عالم افروزِ من است
تابانئ فطرت ہمہ از سوزِ من است

ہر نالۂ موزوں پئے روح است نشاط
نازم بنوائے نو، کہ نوروزِ من است

خدا کی آواز

نفسِ گرم سے جنت کی ہوا آتی ہے　　دل سے اکثر مجھے آوازِ خدا آتی ہے
چھیڑ دیتا ہے مرا سازِ رگِ جاں کوئی　　نظر آتا ہے مرے دل میں غزلخواں کوئی
کئی میخانے چھلک پڑتے ہیں پیمانے سے　　لہلہاتے ہیں چمن پھول کے کاشانے سے

شورِ ہنگامۂ کونین کا ہوتا ہے خموش　　خلوتِ راز سے آتی ہے ہوا نغمہ فروش
اپنی ہستی کو سمجھتا ہوں میں اک عالمِ ہوش　　پرِ جبریل کی کانوں میں صدا آتی ہے

دل سے اکثر مجھے آوازِ خدا آتی ہے

"اے مرے دفترِ تقدیر کا اک نقطۂ خاص　　جسمِ انوار و ضیا، پیکرِ مہر و اخلاص
میں نے اسرارِ حقیقت کا پتہ تجھ کو دیا　　سوزِ دل تجھ کو دیا سازِ نوا تجھ کو دیا
ڈال دی اک نئی دُنیا کی بنا تیرے لئے　　مہر و مہ تیرے لئے ارض و سما تیرے لئے
چاند کی شمع سے روشن کیا راتوں کو تری　　رس دیا نکہتِ الہام سے باتوں کو تری
کھول دی عرش کی اک راہ ترے دل کے قریب　　دُور کرنے پہ بھی رکھا تجھے محفل کے قریب

ہم ترے دل میں ہیں انوارِ سویدا کی طرح　　تجھے گھیرے ہوئے ہم ہیں تری دنیا کی طرح
یہ ہمارے ہی کسی جلوۂ پیدا کی طرح　　پیرہن سے تری خوشبوئے وفا آتی ہے"

دل سے اکثر مجھے آوازِ خدا آتی ہے

"پھر بھی تو بزمِ حقیقت میں ہے کوتاہ نظر　　ہے ترا قول کہ "العلم حجاب الاکبر"
تم نے فطرت کا جو قانون کیا تھا تصنیف　　کیا سمجھتی اُسے ذہنیتِ انسانِ ضعیف
نور کو نار اندھیرے کو اُجالا سمجھا　　نقشِ بے رنگ کو سیمائے ثریا سمجھا
موت کو ٹِٹنے مٹانے کا بہانہ جانا　　اور ہنگامۂ ہستی کو فنا نہ جانا
نظرِ غور کی محتاج ہے تمہید تری　　نقصِ ہستی پہ ہے ناقص ابھی تنقید تری
کون آگاہ ہے کیا وقتِ فنا ہوتا ہے　　ذہنِ انساں کا اندھیرے میں رسا ہوتا ہے
جسم پر دیکھ کے آثارِ مجازی لرزاں　　وہ سمجھتا ہے کہ انسان کو مرنا ہے گراں

بسترِ مرگ پہ آ، درسِ فنا دیں تجھ کو　　موت ہی عینِ بقا ہے یہ بتا دیں تجھ کو
آ یہ اسرار بھی فطرت کے سکھا دیں تجھ کو　　ہم خود آتے ہیں کہ لینے کو قضا آتی ہے"

دل سے اکثر مجھے آوازِ خدا آتی ہے

"تو نہ گھبرا یہ فنا اور بقا کچھ بھی نہیں　　اک فریب ایک تسلی کے سوا کچھ بھی نہیں

موت ہیں تیری کتابوں میں قضا کے معنی
ظاہری تجھ کو سکھائے ہیں فنا کے معنی

روح زندانِ تعین سے جو گھبراتی ہے
لوٹ کر مرکزِ اصلی پہ چلی آتی ہے

جب رہا قیدِ قفس سے کوئی ہوتا ہے اسیر
کیا رہائی کو وہ کرتا ہے فنا سے تعبیر؟

موت تکلیف نہیں، عازمِ رحلت کے لئے
ایک قانون ہے افراد کی عبرت کے لئے

کیا تجھے یاد ہے ہنگامِ ولادت اپنا؟
کیا تجھے یاد ہے دیباچہ خلقت اپنا؟

گریۂ وقت ولادت کی خبر ہے تجھ کو؟
یاد اُس عہد کی شام اور سحر ہے تجھ کو؟

کیفِ تخلیق سے سرشار بنا کر ہم نے
مہدِ تخلیق میں ڈالا تجھے لا کر ہم نے

جب نہیں اپنے فسانے کا بھی عنواں معلوم
پھر ہو کیا تکملۂ ہستیٔ انساں معلوم!

مرض الموت کا تجھ کو نہیں درماں معلوم
ہمیں اس دردِ مصیبت کی دوا آتی ہے"

دل سے اکثر مجھے آوازِ خدا آتی ہے

"ہے ترا علم بھی ناقص ترا عرفاں بھی غلط
ذہن مہمل، تری تخئیلِ پریشاں بھی غلط

درسِ فطرت کے لئے چاہیئے امعانِ نظر
ابھی گہرائی میں فطرت کی نہیں تیرا گذر

دن کو اک صفحۂ سادہ ہے بیاضِ فطرت
رات کی نور میں کھلتی ہے کتابِ قدرت

کہکشاں صرف ہے اک سطرِ کتابِ الہام
اور چھوٹا سا ہے اک دائرہ یہ ماہِ تمام

آسمانوں پہ اشارات کی بچھتی ہے بساط ۔۔۔ یہ ستارے نہیں ہیں مدی لفظوں کے نقاط
اتنے نقطوں میں عبارات ہیں کتنی مضمر؟ ۔۔۔ ان کی کثرت سے کچھ الفاظ کا اندازہ کر؟
رات کے وقت ہو جب محفلِ عالم خاموش ۔۔۔ کر ذرا غور سے نظارۂ ایوانِ سروش

بھیدِ ہستی کا فروزاں نظر آئے گا تجھے ۔۔۔ ہر ستارہ ادبستان نظر آئے گا تجھے
راز اس ساز میں عریاں نظر آئے گا تجھے ۔۔۔ گو بجنے اس میں ہماری ہی نوا آتی ہے"
دل سے اکثر مجھے آوازِ خدا آتی ہے

داغ

بلبلِ شیریں نوا خود بن کے ملہم آگیا ۔۔۔ رازِ حسن و عاشقی اک بات میں سمجھا گیا
وصل کی تفسیر یوں لکھی کہ سرخوش کر دیا ۔۔۔ ہجر کی تصویر وہ کھینچی کہ دل گھبرا گیا
جس کا ہر نغمہ نشاطِ روح کا پیغام تھا ۔۔۔ وہ نوا سنجِ چمن، سارے چمن پر چھا گیا
تشنگی جام و بادہ اب ہی میخانے میں عام ۔۔۔ تھا وہ ساقی اور ہی، جو میکدے برسا گیا
خاکِ دہلی ہوں تری تقدیس پر لاکھوں سلام ۔۔۔ تیرا اک ذرہ ہزاروں بجلیاں چمکا گیا
روح اُس کی آج تک صرفِ بہار و باغ ہے ۔۔۔ سینۂ ماہ و گل و لالہ میں اُس کا داغ ہے

تیرے ماضی کی یاد

مری نظر میں ہے دیباچۂ شباب ترا
کہ مست حُسن کے نغموں سے تھا رباب ترا

وہ تیرا عالمِ طفلی وہ تیرا عہدِ جمیل
سرود و شعر سے وہ ذوقِ بے حساب ترا

وہ اپنے کیف میں خود اک طرح کی مدہوشی
وہ اک مجسّمۂ آلودۂ شراب ترا

مری خوشی پہ وہ تیرا تبسّمِ رنگیں،
وہ میرے جذبۂ برہم پر اضطراب ترا

وہ شوق کے لبِ تشنہ، وہ تیرا عارضِ تر
وہ مشتِ خاک کی قبضے میں آفتاب ترا

وہ آبشارِ رواں مَے کے تیرے ہونٹوں سے
وہ بوئے بادہ میں ڈوبا ہوا گلاب ترا

وہ ابتدائے محبت وہ چاندنی راتیں
مرے کنار میں وہ پُرسکون خواب ترا

وہ وقتِ خواب سنبھلتا ہوا ترا آنا
وہ فرشِ گُل پہ مچلتا ہوا شباب ترا

وہ کروٹوں میں مسکتا ہوا لباسِ لطیف
وہ مستیوں سے چھلکتا ہوا حجاب ترا

کبھی وہ نرمیٔ گفتار پر ترا ہنسنا،
کبھی وہ گرمیٔ آغوش پر عتاب ترا

وہ شب کے سایے میں کافر ملاحتیں تیری
سحر کے بھیس میں وہ حُسنِ لاجواب ترا

وہ التفات، وہ رُجحان وقتِ عرضِ سخن — وہ انکھڑیوں کو جھکانا دمِ خطاب ترا
وہ آرزو سے کھنکتا ہوا سوال مرا — وہ رنگ و بو سے مہکتا ہوا جواب ترا
وہ تیرے گیت ترنّم میں میرا کھو جانا — وہ میرے گرم نفس سے پیچ و تاب ترا
وہ میرے ذوقِ وفا میں فنائیت تیری — وہ ماسوا سے بہر رنگ اجتناب ترا
تری نظر میں مری ہر نظر پیامِ حیات — وہ میری آنکھ میں ہر جلوہ کامیاب ترا

کہاں گیا وہ ترا دورِ سادگی ظالم — جب احتیاط سے بیزار تھا حجاب ترا
کہاں گیا وہ زمانہ، وہ اک جہانِ نشاط — چھُری لئے ہوئے کیوں آ گیا شباب ترا

سلامِ شوق تری اُس حیاتِ رفتہ کو
پیامِ مرگِ محبت ہے انقلاب ترا

نیا عہد نامہ

ہے آج میکدۂ عشق کا نظام نیا — نئی شراب ہے۔ ساقی نیا ہے۔ جام نیا

نیا مغنّیٔ نو کے ہاتھ میں ہے رباب — نیا کلیم، تکلّم نیا، کلام نیا

جمود بستۂ تخیّل کو فرصتِ پرواز — ہوا نئی ہے، فضائیں نئی ہیں، بام نیا

شکستہ ہے قدحِ بزمِ غزنوی و ایاز — ہے عشق و حسن کی محفل میں اہتمام نیا

نظر نواز نئے اب ہیں عارض و گیسو — نیا ہے صبح کا جلوہ۔ جمالِ شام نیا

سمن طراز ہے فطرت بجائے لالہ و گل — روش تمام نئی ہے، چمن تمام نیا

سوادِ کہنۂ گلشن ہے مائلِ تجدید — نئی بہار، نیا رنگ و بو، مشام نیا

ضیائے تازہ ز بامِ افق شب افروز است

نویدِ دورِ صبوحی، کہ صبحِ نوروز است

عطا ہوا نئے ہاتھوں کو انصرامِ وفا — نئے قلم سے لکھا جا رہا ہے نامِ وفا

نمودِ مشرقِ نو ہے جہانِ الفت میں — کہ دے رہی ہے کرن صبح کی پیامِ وفا

یہ کعبہ اور کسی کو نہ اب ملے یارب — حریمِ حسن میں ہو مستقل قیامِ وفا

حدیثِ عشق ہو اور گوشِ التفاتِ جمال
اسی حدیث پہ ہو جائے اختتامِ وفا

نشاطِ روح کو اندیشۂ فنا نہ رہے
نصیب ذوقِ تمنّا کو ہو دوامِ وفا

وفا و حسن کا رنگین وہ اُٹھے سیلاب
کہ پھر اُبھر نہ سکے شوقِ تشنہ کامِ وفا

دعائے حسن، مسرت فزائے روحِ جمال
قبولِ فطرتِ عجز آفریں سلامِ وفا

چمن بہار سے جبتک شگفتہ بار رہے
یہ دو دلوں کا نیا عہد استوار رہے

رنگین تیتری

راتیں بسانے والی، دن جگمگانے والی
تکلیف سہنے والی اور مسکرانے والی

اپنے ہی خاصِ گل پر قربان ہونے والی
اپنے ہی رنگ و بُو سے حیران ہونے والی

عصمت کے گلکدے میں پابندِ دستِ محرم
اُڑنے لگے تو نکہت، گرنے لگے تو شبنم

دامانِ گل سے مستی بن کر اُلجھنے والی
اوراقِ گل کو اپنی دنیا سمجھنے والی

نازک سی موجِ رقصاں، رنگیں سی ایک بجلی
تھکا ہوا سا شعلہ، دبکی ہوئی سی مستی

لرزاں سا اک ستارہ، رخشاں سا ایک جگنو
پر بستہ ایک کوئل، محرومِ رم اک آہو

جذبات کی فضا میں اک ذرّۂ پریدہ
رنگوں کے ارتقا میں اک نقشِ برگزیدہ

کاہیدہ سا ترنم خوابیدہ سا ترانہ
پُر جوشش کیفِ بادہ، خاموش اک فسانہ

صد رنگ پھول جس میں مَردوں کی زندگی ہے
"عورت" اُسی چمن کی رنگین تیتری ہے

ہندوستانی ماں کا پیغام

اے مرے فرزند، اے پروردۂ خاکِ وطن
اے امینِ افتخارِ جذبۂ پاکِ وطن

کون تھی میں اور اب کیا ہوں بتاتی ہوں تجھے
آج اپنا قصۂ ماضی سناتی ہوں تجھے

گھٹ گیا دم، دردِ دل کی پردہ پوشی تابکے
وقتِ اظہارِ حقیقت ہے خموشی تابکے

پہلے میں بچوں کو دیتی تھی پیام و درسِ جنگ
بھر دیا کرتی تھی دل میں سرفروشی کی امنگ

میں بھی خود تیر افگنی، صید افگنی میں فرد تھی
گھر میں عورت تھی، سیاست کی فضا میں مرد تھی

مشورے مجھ سے لیے جاتے تھے امن و جنگ کے
تھی بیاضِ ذہن میں خاکے ہزاروں رنگ کے

پاک دل سے پہلے سب نے تھی غمخواری مری
"مادرِ مشرق" سمجھ کر تھی پرستاری مری

میرے بچے صف شکن تھے، اور تیر انداز بھی
منچلے بھی، صاحبِ ہمت بھی، سرفراز بھی

تھا حکومت میں مرا حصہ، سیاست میں بھی تھا
دخل میرا اہتمامِ ملک و ملت میں بھی تھا

یاد ہے دشت و جبل کو ہمتِ سیر و شکار
گرد سے آگے اُڑا کرتا تھا میرا راہوار

میں الٹ دیتی تھی دشمن کی صفیں تلوار سے
دل دہل جاتے تھے شیروں کے، مری للکار سے

جرأت ایسی، کھیلتی تھی دشنہ و خنجر کے ساتھ
یا وفا ایسی کہ ہوتی تھی فنا شوہر کے ساتھ

رفتہ رفتہ "احتیاط و مصلحت" کا غل ہوا
خود غرض انساں، اسیرِ حلقہ کاکل ہوا

سب سے پہلے میری آزادی یہاں چھینی گئی
ذہن کچلا، دل کیا غارت، زباں چھینی گئی

چھٹ گیا ہاتھوں سے میرے دامنِ علم و عمل
کر دیا محلوں میں لا کر قید مجھ کو بے محل

مسلکِ اہلِ ہوس میں، "میں حسیں" سمجھی گئی
بزمِ ہستی کی "متاعِ بہتریں" سمجھی گئی

کوئی کہتا تھا فرشتہ، حور کہتا تھا کوئی
شکلِ انساں میں خدا کا نور کہتا تھا کوئی

چھین کر تلوار پہنا دیں سنہری چوڑیاں
رکھ دیا ہر جوڑ پر زیور کا اک بارِ گراں

پہلے جن آنکھوں کا تنقیحِ حقیقت کام تھا
اب زبانِ عشق میں "بیمار" ان کا نام تھا

پہلے جو زلفیں، رسن تھیں ظلم رانوں کے لئے
اب فقط کالی گھٹا تھیں، عیش خانوں کے لئے

پہلے جس قامت پہ پھبتا تھا لباسِ خسروی
ریشمی پیراہنوں سے اسکی آرائش ہوئی

پہلے جو تیور تھے بجلی، اب حیا آسودہ تھے
جن سے کف اڑتا تھا، اب لب مسی آلودہ تھے

ہوتے ہوتے یوں ہوئی تحلیل جسمانی مری
بن گئی عینِ نزاکت خستہ سامانی مری

اک نئے دوزخ کی تیاری ہوئی میرے لئے
"گھر کی جنت"، چاردیواری ہوئی میرے لئے

نصف قومیت گھروں میں بند جب کر دی گئی
ملک کی کمزوریوں کو مل گئی قوت نئی

مرد سمجھے مجبورِ افتادِ دوامی کے لئے
اور میں تھی وقفِ تخلیقِ غلامی کے لئے

درس آزادی کا دیتی کیا تجھے آغوش میں — میں تو خود ہی قید تھی اک مجلسِ گُل پوش میں
میں نے دانستہ بنایا خائف و بزدل تجھے — میں نے دی کم ہمتی کی دعوتِ باطل تجھے
دل کو پانی کرنیوالی لوریاں دیتی تھی میں — جب گرج ہوتی تھی دامن میں چھپا لیتی تھی میں
توپ اور تلوار کا لیتی نہ تھی میں نام تک — صبح سے پیشِ نظر رکھتی تھی تجھ کو شام تک

ہاں تری اس پست ذہنیت کی میں ہوں ذمّہ دار
تُو تو میری گود ہی میں تھا غلامی کا شکار

اب میں سُنتی ہوں کہ نظمِ بزم ہے بدلا ہوا — اہلِ محفل کا خیال و عزم ہے بدلا ہوا
اب میں سُنتی ہوں کہ عورت کو ملے ہیں کچھ حقوق — عرصۂ علم و عمل میں اُسکو حاصل ہے وثوق
اب میں سُنتی ہوں اُسے آزادیٔ تقریر ہے — اب میں سُنتی ہوں کہ گویا پیکرِ تصویر ہے
اس لئے بیخوف اک پیغام دیتی ہوں تجھے — لے، دوائے گردشِ ایّام دیتی ہوں تجھے

گو مقیّد اب بھی میرا پیکرِ ناشاد ہے
روح تو ابرِ ہمالہ کی طرح آزاد ہے

سُن کہ اس دنیا میں ملتا ہے اُسی کو اقتدار — جس کو اپنی قوتِ تعمیر پر ہو اختیار

زندگی کے جو بلند و پست سے آگاہ ہو
محفلِ عالم کے بند و بست سے آگاہ ہو

ظلمتوں میں لیکے جو نکلے صداقت کا چراغ
فلسفے سے ارتقا کے جسکا روشن ہو دماغ

جسکو ہو معلوم مقصد ہستیٔ مخلوق کا
جس کو ہو احساسِ کامل پستیٔ مخلوق کا

جس کے دل میں درد ہو اہلِ وطن کا موجزن
ہو رگوں میں جسکی پنہاں سوزِ ناموسِ وطن

جو غلامی کو سمجھ لے لعنتِ انسانیت
جسکا نصب العین ہو حرّیتِ انسانیت

اپنی عزت جو یقیں کرتا ہو عزت ملک کی
جان دیکر بھی جو کرسکتا ہو خدمت ملک کی

جس کی نظروں میں ہو باغِ خلد صحرائے وطن
بھوک میں اور پیاس میں بھی جسکو یاد آئے وطن

ذہن جس کا جذبۂ اصلاح سے معمور ہو
نسلِ تخریب و شورش سے جو کوسوں دور ہو

جو حقیقت سے ہر اک باطل کا رشتہ جوڑ دے
نخوت و پندار کے جھوٹے بتوں کو توڑ دے

محفلِ انسانیت میں کچھ نہیں اُسکا وقار
جو نگاہِ ملک و قومیت میں ہو بے اعتبار

جس کا مقصد پیٹ بھرنے کے سوا کچھ بھی نہ ہو
کام جس کا کچھ نہ کرنے کے سوا کچھ بھی نہ ہو

خود غرض، خود کام، بد اندیش ہو، بدنام ہو
شورشِ عالم میں جو ناواقفِ انجام ہو

جادۂ حرص و ہوا میں ٹھوکریں کھاتا پھرے
چیل کوّوں کی طرح دن رات منڈلاتا پھرے

جس کو جہل و کبر کے اوہام سے فرصت نہ ہو
خوابِ صبح و سرخوشیٔ شام سے فرصت نہ ہو

جس کا مشرب مکر و فن ہو جس کا مذہب فریب
جو ذراسی پھانس سے ہو جائے مطلق ناشکیب

جو منافق ہو ریاکار اور دنیا ساز ہو
جو فضا کی پستیوں میں مائلِ پرواز ہو

قوم سے اور ملک سے غداریاں کرتا رہے
شورشِ بے کار کی تیاریاں کرتا رہے

بے محل نغموں کو سمجھے سب کہیں ننگِ وطن
مضمحل ہاتھوں میں جس کے سرد ہو چنگِ وطن

جو غلامی کے لباسِ تنگ میں اکڑا پھرے
نام کا آزاد ہو، زنجیر میں جکڑا پھرے

زر پرستی کے لئے بنجائے جو ملت فروش
بے حمیت ہو، وفا دشمن ہو، اور غیرت فروش

اس سے بڑھ کر اور قسمت کا کوئی ہیٹا نہیں
وہ تو "ابن الوقت" ہے کوئی مرا بیٹا نہیں

شاعر کا مذہب

مجھے کانٹوں سے بھی دلبستگی، پھولوں سے اُلفت ہے
عقیدت میں مری کل کائنات اک بزمِ فطرت ہے

نہیں محدود رسم و راہ تک ذہنِ رسا میرا
ہو گرد آلود کیوں ان لعنتوں سے آئینا میرا

کلیسا میں بھی مجھ کو موقعِ تکمیلِ مستی ہے
مجھے محرابِ کعبہ میں بھی اذنِ بُت پرستی ہے

حدودِ میکشی ہیں خلوتیں پرہیزگاروں کی
پھرا کرتا ہوں سرخوش انجمن میں چاند تاروں کی

سمجھتا ہوں کہ ہر انساں کے دل کا آئینا میں ہوں
نہیں نفرت کسی سے وہ نگاہِ آشنا میں ہوں

خیالوں میں مرے وسعت بقدرِ ذوقِ سجدہ ہے
یہ ساری بزمِ عالم وقتِ سجدہ میرا معبد ہے

قیودِ سبحہ و زنار سے بھی ماورا ہوں میں
تعیُّن کی حدیں ٹھکرا کے آگے بڑھ گیا ہوں میں

مجھے مطلب نہیں دیر و حرم کی تنگنائی سے
براہ راست ہے اک واسطہ عرشِ الٰہی سے

خدا کا نام لے کر توڑتی ہیں میری تکبیریں
یہ کس نے ڈال دی ہیں پاؤں میں انساں کے زنجیریں؟

کرو اعلان، ہے فطرت ہی اک مذہب انساں کا
مری ملت میں جھگڑا ہی نہیں کفر اور ایماں کا

پھر اس اعلان میں گنجائشِ چون و چرا کب ہے
کہ جو فطرت کا مذہب ہے وہی شاعر کا مذہب ہے

انتباہ

اے کہ تو گلزارِ فطرت کا شگفتہ پھول ہے　　اے کہ مستقبل ترا اک مایۂ مقبول ہے

اے کہ تیری آنکھ میں ہے ارتقا کی روشنی　　اے کہ پنہاں ہے ترے دل میں وفا کی روشنی

پیکرِ پر نور تیرا صد گل و صد رنگ ہے　　انقلابِ ہستیٔ عالم تری آہنگ ہے

تیری نازک زندگی کا ٹھونٹیں تھی الجھی ہوئی　　باوجود اسکے بھی فطرت ہے تری سُلجھی ہوئی

بارہا دھوکے دیئے امیدِ باطل نے تجھے　　راستے سے بارہا بھٹکا دیا دل نے تجھے

ناگہاں فطرت نے تجھ کو اک صدائے ہوش دی　　عشق کی پہلی نظر نے دعوتِ آغوش دی

حق محبت کے ترے آگے ادا ہونے لگے　　یعنی تیرے پاؤں پر سجدے روا ہونے لگے

ہر ادا حسن و وفا کا کیف برسانے لگی،　　عشق کی خلوت میں جنت کی ہوا آنے لگی

اوّل اوّل کچھ گلے، کچھ شکوہ خوانی بھی رہی　　بے نیازی بھی رہی، نالہ فشانی بھی رہی

آخر آخر ختم یہ سب داستانیں ہو گئیں　　ترجمان اک دل کی گویا دو زبانیں ہو گئیں

عارضی اک دورِ فرقت ناگہاں حائل ہوا　　امتحاں پر جذبۂ حسن و وفا مائل ہوا

عشق بیچارہ مسافر بن کے جا پہونچا وہاں   کوئی پیغامِ وفا لیکر نہ پہونچا تھا جہاں
داستانِ درد سن کر رحم کچھ آیا تجھے   دامنِ مژگاں سے آنسو تو نے پونچھے عشق کے

آہ وہ باتیں تری تسکین بخش و دلفریب   وہ تری قسمیں، وہ دلجوئی، وہ تدبیرِ شکیب
وہ جھلکنا آنسوؤں کا تیری چشمِ ناز میں   وہ شرارے غم و ہمت کے تری آواز میں
رفتہ رفتہ یہ ہوا ثابت وہ سب اک خواب تھا   جوشِ ہنگامی ترا جاتا ہوا سیلاب تھا
ہو گیا ثابت تری فطرت ہے آسانی پسند   وقت پہ ہو جائے جو کچھ تو ہے اس پر کاربند
تیرے دل میں ہمت و احساس مطلق بھی نہیں   تجھ کو پیمانِ وفا کا پاس مطلق بھی نہیں

ہر ہوس میں نظر آتی ہے تجھ کو شانِ عشق   شورشِ حرص و غرض بھی ہے تجھے اعلانِ عشق
ٹین کے ٹکڑے کو بھی تو جانتا ہے آفتاب   کاغذی پھولوں سے آتی ہے تجھے بوئے گلاب
سوچ کس کے دل میں ہے تیرا حقیقی اضطراب؟   غور کر، تیرے لئے ہے زندگی کس کی خراب؟
ایک ہی اس بزم میں تیرا پجاری ایک ہے   اور سب جھوٹے ہیں وقفِ جاں نثاری ایک ہے
خلوتِ تخئیل میں اس کی ہے تو چھایا ہوا   ہے وہ تیری حسن کی گرمی سے گھبرایا ہوا
اس کے دل کی بیقراری گرمیٔ محفل سے پوچھ   بیٹھ کر یکسو تو اس کا حال اپنے دل سے پوچھ

دے اُسے دعوت، بلا اپنے تصور میں اُسے ... دیکھ دل کی آنکھ سے، بزمِ تحیر میں اُسے

اُس سے باتیں کرکے اُسکا حالِ دل دریافت کر ... اسقدر کیوں ہے طبیعت مضمحل دریافت کر

اُسکو دے تسکین اپنی نزہتِ گفتار سے ... شوق کی باتیں کر، اُسکی خاطرِ بیمار سے

دیکھ پھر چشمِ تصور سے، جو اُسکا حال ہے ... بے نیازی سے تری وہ کسقدر پامال ہے

وہ تری بزمِ تخیل میں سکوں برسائے گا ... دل ترا اُس کے تصور سے تسلّی پائے گا

جانتا ہوں میں تری فطرت بہت معصوم ہے ... تو ابھی اک نقش سادہ ہے، مجھے معلوم ہے

جس طرح اپنی حقیقت سے ابھی واقف نہیں ... روح بھی تیری محبت سے ابھی واقف نہیں

اے تغافل کے پجاری، اے طبیعت کے غلام، ... اک پریشانِ وفا کا آخری سن لے پیام،

بے نیازی حسن کی جانِ وفا سہتی نہیں ... عشق کی آغوش خالی فطرتاً رہتی نہیں

اب بھی ہیں گنجائشیں تیری کنارِ عشق میں ... رنگ تیرا ہی فروزاں ہے بہارِ عشق میں

آنسوؤں میں عشق کے اب بھی ہے ہمدردی تری ... عشق کے چہرے پہ چھائی ہوئی زردی ہے تری

اب بھی تیرا نام لیکر عشق کرتا ہے فغاں ... اب بھی روح و قلب میں ہے عشق کی تو نغمہ خواں

اب بھی قدموں پہ ترے اُسکی جبیں مسجود ہے ... اب بھی وہ بندہ ہے تیرا اور تو معبود ہے

ہے ابھی باقی ترے عہدِ وفا کا اعتبار ... ہو دماغِ خلق میں جیسے خدا کا اعتبار

حرص مندوں کے پراگندہ قفس کو چھوڑ دے ... عشق کی آغوش میں آ جا، ہوس کو چھوڑ دے

شاعر ہے جانِ فطرت　　اسرار دانِ فطرت　　روح و روانِ فطرت
گوش و زبانِ فطرت
تخیل کو بیاں کے سانچے میں ڈھالتا ہے
الفاظِ بے زباں کے معنی نکالتا ہے

شاعر ہے وہ پیمبر　　نازل ہوا ہے جس پر　　الہامِ حق کا دفتر
سارے جہاں کا رہبر
جب وہ پکارتا ہے گم گشتہ کارواں کو
دیتی ہے روح بوسے ہر جنبشِ زباں کو

شاعر ہے سازِ محفل　　سوز و گدازِ محفل　　آگاہ رازِ محفل
مقصد نوازِ محفل
ہر ساز میں اسی کی آواز گونجتی ہے

ہر نغمہ ہے اُسی کا، ہر نغمے میں وُہی ہے

شاعر ہے جوشِ ہستی | مستی فروشِ ہستی | خلّاقِ ہوشِ ہستی

تعمیر کوشِ ہستی

شاعر نہ ہو تو صورتِ ملہم فضول جائے
شاعر نہ ہو تو دُنیا نظم اپنا بُھول جائے

گناہِ عشق

خالقِ بحر و بر ہے عشق، مالکِ خیر و شر ہے عشق
کہتے ہیں سب جسے خدا، کوئی نہیں، مگر ہے عشق

عشق نہ ہو تو حُسن کو کون دکھائے آئینہ
حُسن ہے جس پہ خود نثار، حُسن کی وہ نظر ہے عشق

عشق وہی تو برق ہے جسکی تڑپ ہے روح میں
گرم ہے قلبِ کائنات جس سے وہی شرر ہے عشق

عشق کے دم قدم سے ہے شور و سکون کا سلسلہ
رونقِ انجمن ہے عشق، گرمیٔ رہگذر ہے عشق

ہے یہ متاعِ جاوداں، جنسِ وفا یہی تو ہے
سود و زیاں سے بے نیاز دولتِ بیخطر ہے عشق

ہیں یہ دل و جگر فضول عشق اگر نہ ہو نصیب
دل کی حیات عشق ہے، زندگیٔ جگر ہے عشق

دے نہ فریبِ ترکِ عشق مجھ کو، کہ جانتا ہوں میں
تیری نگاہ پست ہے اور بلند تر ہے عشق

مجرمِ ذوقِ عشق ہوں، حال مرا گواہ ہے
مجھ کو قبول یہ گناہ، عشق اگر گناہ ہے

عروجِ شبہائے ماہ کا ہے، ضیا فضاؤں پہ چھا رہی ہے
عروسِ شب بے حجاب ہو کر، تجلّیوں میں نہا رہی ہے
چمک رہا ہے دُھلے ہوئے آسمان پر چاند چودھویں کا،
برس کے بادل ابھی کھلے ہیں، فضا کی خنکی بتا رہی ہے
فلک بھی روشن، زمیں بھی روشن، مکاں بھی روشن، مکیں بھی روشن
جہان ہے اور روشنی ہے نظر جہاں تک بھی جا رہی ہے
سکوت دُنیا پہ حکمراں ہے، نہ داستاں گو نہ داستاں ہے
عجیب منظر، عجب سماں ہے، نگاہ اِترائی جا رہی ہے
ہے ایک طوفانِ رنگ و نور اور اس میں تیری ہوئی ہے دُنیا
بہار کی رنگ آفرینی نو کی موجیں بڑھا رہی ہے
پہاڑ جنت بنے ہوئے ہیں، محیط ہے نور چوٹیوں پر،

کرن جو ہے آبروئے چشمہ وہ آئینے سے بنا رہی ہے
ہے دَور میں چاند کا پیالہ، اُفق پہ پھیلی ہوئی ہے مستی
رواں ہے یوں آبشار، گویا شراب فطرت بہا رہی ہے
فضا یہ رنگین اور سُنہری، یہ وقت خاموش اور ٹھنڈا
یہ ہے طلسمِ نظر فریبی، کہ رات جادو جگا رہی ہے

تلاطمِ رنگ و بو میں کیفِ نظر ہے اک پُرشباب جوگن
جو اپنے ماحول کی خموشی میں زندگی بن کے چھا رہی ہے
قریبِ چشمہ، سجائے بیٹھی ہے مرگ چھالے پر اپنی دنیا
کوئی تو ہے چاند میں یہ جس سے نشیلی نظریں لڑا رہی ہے
نہ یادِ عقبیٰ، نہ ذکرِ دنیا، نہ فکرِ مستی، نہ ہوشِ ہستی
وہ محوِ آئینِ خود پرستی، فضا کے دل میں سما رہی ہے
اُدھر ہے اک آبشار لرزاں، ادھر ہے زلفِ رسا پریشاں
وہ اپنی موجیں دکھا رہا ہے، یہ اپنی موجیں دکھا رہی ہے
حسین جوگن، جوان جوگن، جوان راتوں کی جان جوگن

خیال بن کر کسی کے رنگیں خیال میں کھوئی جا رہی ہے

یہ جاذبِ جزو و کل تصوّر! کہیں وہ عالم اُلٹ نہ جائیں
یہ کیوں کشش آزما رہی ہے یہ کیا قیامت اُٹھا رہی ہے

یہ دن تو ہستی کے گلکدے میں بہار افروزیوں کے دن تھے
تو کیوں یہ سنسان جنگلوں میں شباب اپنا لٹا رہی ہے

یہی ہے وہ عمر اور وہ موسم، بنا دے دیوانہ جس کو چاہے
نظر نظر اس کی دل نشیں ہے، ادا ادا مسکرا رہی ہے

مگر یہ فطرت کی ہے پجارن، تصوّر و محویت کی دیوی؟
نظر میں کوئی بسا ہوا ہے، کسی کو دل میں بسا رہی ہے

نہ آنکھ جھپکے، نہ ہونٹھ لرزیں، نہ ہاتھ اُٹھیں نہ پاؤں بھٹکیں
یہ اپنے آسن پہ بیٹھے بیٹھے قریب منزل کے جا رہی ہے

جمال سے اس کے پا رہا ہے فروغ ماہ تمام کیا کیا
نگاہ خود موجِ بادہ بن کر فضا کی مستی بڑھا رہی ہے

یہ محو و مستِ خیالِ فطرت، شبابِ فطرت، جمالِ فطرت
جہاں کی فانی لطافتوں کو بقا کے آئیں سکھا رہی ہے

خیال طے کر رہا ہے تیزی سے جادۂ منزلِ حقیقت
وہ خود ہے مرکز پر اپنے قائم نہ آ رہی ہے نہ جا رہی ہے
پیامِ فطرت کا سُن رہی ہے یہ گوشِ باطن سے محو ہو کر
اور اس کی یکسر زبان خموشی، پیامِ فطرت سُنا رہی ہے
کہ جو حقیقت میں جذب ہو کر یہاں حقیقت پرست ہوگا
اُسی کی رنگیں تجلّیوں سے دماغِ نظّارہ مست ہوگا

عقل و عشق

ایکہ مے بازی بہ سازِ مغربی   زیرکی و عشق، عشق و زیرکی
زیرکی در عشق عینِ گمرہیست   بر حواسِ تو، اساسِ زندگیست
عشق چوں با زیرکی محکم شود   کائناتِ عاشقی برہم شود
عشق را با زیرکی آمیختن   نیست جز خونِ دو عالم ریختن
تو وہمدِ تعلیمِ عشق و زیرکی   ما دُ نازِ عشق و سازِ بیخودی
کائناتِ ما صدائے سازِ ما   سازِ ما ہمرازِ ما آوازِ ما،
ما زسازِ خویش سوزی یا قلیم   در جہانِ جانِ جاں بے تاقلیم
بیخودی ما را خدا آموز شد   شامِ ما قبلِ سحر نور روز شد
تو و خود بینی کہ خوئے ناکس است   ما خدا بینیم، ما را ایں بس است

صبح صادق

مجھے کیفِ بادۂ صبح ہے، تجھے لطفِ خوابِ سحر میں ہے
وہ کہاں ہے تیرے خیال میں، جو بہار میری نظر میں ہے
کبھی میری بزمِ سحر میں آ، تجھے میں دکھاؤں وہ آئینہ
جو تجلّیوں سے بھرا ہوا، مری چشمِ جلوہ نگر میں ہے
ہوئی ختم محفلِ کہکشاں، ہے فسردہ رات کا کارواں
نہ ہیں وہ ستاروں کی شوخیاں، نہ وہ موجِ نورِ قمر میں ہے
اثرِ سحر سے کھِلا ہوا، ہے کنول کا پھول بنا ہوا
جو اک اشکِ گرم چھپا ہوا، کہیں چاکِ دامنِ تر میں ہے
یہی لمحہ صبحِ ظہور ہے، یہی لحظہ مشرقِ نور ہے
عجب انتظامِ سرور ہے، کبھی دل میں ہے کبھی سر میں ہے
تو برونِ خانہ برآ کہ ہیں، کہ نگاہِ جلوہ نمائے من

سحرے عجیب نگاشتہ بسوادِ پردہ سرائے من

ابھی راہ میں ہے عروسِ شب، ابھی گرم محفلِ ناز ہے
ابھی پر پڑے ہیں جلے ہوئے، ابھی شمع صرفِ گداز ہے
ابھی ہوش تشنۂ ہوش ہے، ابھی ہیں سکوت میں شورشیں
ابھی کائنات خموش ہے، ابھی بے صدا لبِ ساز ہے
ابھی عیش کامی دہر خوشی، ہے اسیرِ نشۂ بے خودی
ابھی محوِ خواب ہے غزنوی، ابھی سرد حسنِ ایاز ہے
ابھی عرش پیشِ نگاہ ہے، ابھی رو برو ہیں حقیقتیں
ابھی روح مستِ نیاز ہے، ابھی دل پہ بارشِ راز ہے
جو ہے میری زندگی نظر، وہ ہے میرے سامنے جلوہ گر
یہی دورِ عشرتِ سجدہ ہے، یہی میرا وقتِ نماز ہے

تو بیا و شغلِ صبوح کن، بشراب روح فزائے من
سحریست میکدہ در قفس زکمالِ صدق و صفائے من

صبوحی

صبح سے پہلے کیا بیدار قسمت نے مجھے
دعوتِ گلگشت دی کیفِ طبیعت نے مجھے

آنکھ کھلتے ہی صبوحی کا مجھے آیا خیال
ہنس کے دیکھا صبح کی رنگیں صباحت نے مجھے

فرصتِ سیر و تماشا کو غنیمت جان کر
کر دیا بیزارِ خلوت دل کی حسرت نے مجھے

دیر تک مجھ کو رہا ساقی کا اپنے انتظار
خوب گردش دی صبوحی کی ضرورت نے مجھے

تھی ابھی تاخیر معمولاً "طلوعِ حسن" میں
شعلہ برپا کر دیا تھا دل کی وحشت نے مجھے

اپنے پیمانوں سے چھلکا کر محبت کی شراب
ناگہاں آواز دی تاروں کی عصمت نے مجھے

غنچے نے جھکی ہوئی اپنی صراحی پیش کی،
دی گلابی، تازہ پھولوں کی لطافت نے مجھے

میرے ہونٹوں تک بڑھایا اپنا ساغر چاند نے
صرفِ حیرانی کیا دنیا کی وسعت نے مجھے

حملہ آور ہر طرف سے ہو گئی مجھ پر فضا
لے لیا آغوش میں جلوؤں کی جنت نے مجھے

جب مری وحدت خیالی میں نہ آیا انقلاب
جب نہ لطف اندوز دیکھا بزمِ فطرت نے مجھے

پیش لیلائے سحر نے کر دیے اپنے عذار
یا نوازا ایک دوشیزہ حقیقت نے مجھے

روح کی افسردہ سامانی میں لرزش آ گئی
ہاتھ سے کھویا ہی تھا جوشِ مسرت نے مجھے

میکدہ برلب یکایک میرا ساقی آگیا کرلیا جذب اک تبسّم ریز طلعت نے مجھے
حسن کی آغوش میں تسکین روحی مل گئی
صبح کو تابش ملی، مجھ کو صبوحی مل گئی

عرضِ تجلّی

فریبِ جلوہ ہیں یہ پردہ ہائے شبنم و گل
چمن طرازِ حقیقت مجھے خراب نہ کر

سرور بن کے سما جا نگاہِ حیراں میں
ہلاکِ جلوہ کو نا آشنائے خواب نہ کر

شگفتِ لالہ میں کر سیرِ خونچکانیٔ دل
کلی میں چھپ کے تماشائے اضطراب نہ کر

شعاعِ صبح چمن سے نہ آفتاب گرا
حدودِ شوق میں تخلیقِ التہاب نہ کر

رجوع اپنی طرف کرکے بے نیاز نہ ہو
لبوں سے کھینچ کے آزردۂ شراب نہ کر

جلیسِ جلوتِ نظارہ کر تجلّی کو
انیسِ خلوتِ ناکارۂ نقاب نہ کر

بنا صنم کدۂ آذری گلستاں میں
کسی کے ذوقِ پرستش سے اجتناب نہ کر

الٹ بھی دے سمن و نسترن کے پردوں کو
مری نظر سے ہم آغوش ہو حجاب نہ کر

فضول اسیر سراپردۂ نمو تو ہے
مجھے ہی علم کہ پھولوں میں رنگ و بو تو ہے

برقِ سرِ رہگذار

سرگشتۂ جادہ تھا نظارۂ آوارہ — جب چرخ پہ باقی تھا شاید ہی کوئی تارہ
تصویرِ سحر کی جب مائل بہ صباحت تھی — آئینۂ بے جوہر جب چاند کی صورت تھی
جب آنکھ چمن کی تھی لبریزِ تجسّس سے — جب راستے خالی تھے ناپاکیِ تنفّس سے
چڑیوں کے ترنّم سے معمور فضائیں تھیں — پھولوں کے تبسّم سے، رنگین ہوائیں تھیں
کیوپڈ ابھی ترکش کو چھونے بھی نہ پایا تھا — ہر شے تھی دھندلکے میں. ہر چیز پہ سایا تھا
آہستہ ردائے شب سمٹی ہوئی جاتی تھی، — خورشید کی انگڑائی کرنوں کو جگاتی تھی،

کچھ ڈھونڈتی چتون سے، کچھ کھیلتی آنچل سے — اک برق نظر آئی ٹپکی ہوئی بادل سے
مستانہ خرام اُس کا اعلانِ قیامت تھا — ہر عشوۂ کافریں سامانِ محبت تھا
ایک تیر تھا پیوستِ دامانِ فضا گویا — اک رنگ تھا مصروفِ پروازِ ہوا گویا
چتون جو حیاؤں سے گرمائی ہوئی سی تھی — جلوت کے تصور سے گھبرائی ہوئی سی تھی
دُھن رات کے پردے میں منزل پہ پہنچنے کی — وہ موج کو بیتابی ساحل پہ پہنچنے کی

ہمراز سے آہستہ وہ راز کی کچھ باتیں، اسرار سے وابستہ، رستے کی ملاقاتیں
بجلی کہوں یا رنگیں اک تیر کہوں اس کو یا حسن کی منزل کا رہگیر کہوں اس کو

آہستہ چل آہستہ، اے پیکرِ رعنائی پامال نہ ہو جائے تخئیلِ تماشائی
دزدیدہ نگاہی سے اک جام پلائے جا پُرشوق مسافر کے ارمان مٹائے جا
آہستہ چل آہستہ، اے جلوۂ نورانی بھر لینے دے نظروں میں جلووں کی درخشانی
دن بھر کے لیے تجھ سے اخذ ایک فسوں کر لوں ہنگامۂ ہستی کو مانوسِ سکوں کر لوں
آہستہ چل آہستہ، اے موجِ مئے ہستی پی لینے دے آنکھوں سے بہتی ہوئی مستی
ہے چاند بھی پوشیدہ اور ڈوب گئے تارے اب صرف مجھی کو ہیں قسمت ترے نظارے
آہستہ چل آہستہ، اے طلعتِ شائستہ اے برق کی ہمجولی، آہستہ چل آہستہ
ہموار تمنّا کا سیلاب تو ہو جائے
کافر مرا نظّارہ سیراب تو ہو جائے

حسن کو دعوتِ سکوں

(فطرتِ حسن کے مطالعے کے بعد)

پھول اور کلیوں کو پرکھا، سبزہ زاروں کو پڑھا
کوہ اور صحرا کو جانچا، آبشاروں کو پڑھا
درس ہر ہنگامۂ خاموشِ ہستی سے لیا
بستیوں سے دور جا کر مزاروں کو پڑھا
دن کو سورج کی شعاعوں پر رہا مصروفِ غور
رات کو ڈوبے ہوئے خاموش تاروں کو پڑھا
ابر کے صفحوں پہ دُہرایا حدیثِ برق کو
چاند کی نظروں میں فطرت کے اشاروں کو پڑھا
اس دبستانِ جہاں میں تھا یہی مقصودِ عمر
یعنی لاکھوں کو پڑھایا اور ہزاروں کو پڑھا

باوجودِ علم لیکن میں سپر انداز تھا
جو سمجھ ہی میں نہ آیا حسن ایسا راز تھا

اے کہ تو فطرت میں اپنی سبزہ شاداب ہے
یا طلوعِ صبح ہے، یا مشرقِ مہتاب ہے
اے کہ تو خاموش موسیقی ہے بزمِ قدس کی
ساز تیرا آج تک بیگانۂ مضراب ہے
اے کہ ہے تیرا تخیّل رفعت و عظمت پسند
کہکشاں کی رفعتوں پر تیرا فرشِ خواب ہے
اے کہ تیرے دل میں ہے احساس کا دریا رواں
ذہن میں تعمیرِ مستقبل کا اک سیلاب ہے
اے کہ تو خود شعر ہے، خود شاعرِ سیمیں نوا
موجۂ افکار تیرا قلزمِ سیماب ہے
اے کہ تیری سادگی ہے جلوہ گاہِ رنگ و بو
اے کہ بے رنگی میں تیری ہے پناہِ رنگ و بو
پھول ہے تو صدق کی خوشبو سے مہکایا ہوا

یا ہے موتی ابرِ مینا گوں سے برسایا ہوا

ہے صباحت سے تری نورِ حقیقت بے حجاب
تجھ پہ اب تک رنگِ صبحِ خلد ہے چھایا ہوا

زندگی کی آگ ہیں، نور آفریں شعلے ترے
عشق کا سینہ ہے ان شعلوں سے گرمایا ہوا

تُو بہ ایں اوصاف، ہے غم آشنا و سرگراں
شورشِ حرص و ہوا سے سخت تنگ آیا ہوا

آہ، تو بھی محشرِ عالم میں میری ہی طرح
جستجو میں ہے سکونِ دل کی گھبرایا ہوا

میرے دل میں بیٹھ جا، کیفِ دروں مل جائے گا
میرے دل کے ساتھ تجھ کو بھی سکوں مل جائے گا

ہیں ہوس کے سینکڑوں چنگل تری جانب دراز
عشق میں اور حرص میں آساں نہیں ہے امتیاز

ایک ربطِ مستمر ہی ہے حسن میں اور عشق میں
عشق ہے عبدِ مجازی، حسن معبودِ مجاز

عشق جویائے محبت، عشق جویائے جمال

اور ان دونوں کا ملنا عشرتِ ناز و نیاز

ربطِ حسن و عشق میں پنہاں ہیں اسرارِ سکوں

غزنوی کے کیف سے ہے مستیٔ زلفِ ایاز

مطمئن ہو کر کنارِ عشق میں ہو جلوہ گر،

ہے وہ ہی دلدوز نغمہ ہو جو ہم آہنگِ ساز

بے سکونی کا سبب یہ ہے کہ بے آئیں ہے تو!

اے سکونِ دو جہاں، خود دشمنِ تسکیں ہے تو!

لالہ زاروں، آبشاروں، اور کہساروں کو دیکھ

باغ میں پھولوں کو، خارستان میں خاروں کو دیکھ

ماسوا سے بے غرض، خاموش، یکسو، بے نیاز،

کس قدر بے خود ہیں، فطرت کے طلبگاروں کو دیکھ

ہے جہاں نظارگی ان کا ہمہ بیزارِ نظر

ان کی فطرت میں ہیں کیسی رفعتیں تاروں کو دیکھ

ہیں سبھی میخانۂ ہستی میں ساقی در نگاہ

غور کی نظروں سے اس محفل کے سرشاروں کو دیکھ
دُور کیوں جاتا ہے، ہیں خود ہوں ترے پیش نظر
تُو تری جانب ہے، میرے دل کے انگاروں کو دیکھ

شمع روحِ ماستی از دہر دل بیگانہ کُن
کیفؔ اگر خواہی توجہ جانبِ پروانہ کُن

مساواتِ فطرت

معین کر لیا تھا فیصلے نے ابنِ آدم کے
کہ یہ لمحے مسرت کے ہیں یہ اوقات ہیں غم کے

طلوعِ ماہ، اک تمہید تھی حُسنِ تعین کی
کیئے جاتے تھے قائم جس پہ عنواں عیش و ماتم کے

اسیرِ عیش و غم ہونا یہ منشائے طبیعت تھا
کبھی رنگِ شگفتِ گل، کبھی انداز شبنم کے

جب آئی موج، دل بھاری کیا، آنسو بہا ڈالے
کیا جب عزم، خط آنکھوں میں کھینچے ساغرِ جم کے

مگر فطرت، کہ قانونِ مساوات اُسکا واحد تھا
تبسم کر رہی تھی دیکھ کر یہ رنگ عالم کے

بالآخر جذبۂ غم نے جگہ لی نفسِ فطرت میں
بساطِ عیش سمٹی، خونِ دل کا رنگ یا جم کے

ہوا دورِ مسرت ختم عہدِ سوگوار آیا
فضا پر چھا گئے تاریک بادل یاسِ پیہم کے

وہ احساسِ نشاط و جذبۂ عشرت ہوا ٹھنڈا
فریبِ ماہ بن کر دل کے داغِ خونچکاں چمکے

مسرت منقلب گردید عالم نالہ یکسر شد
ہلالِ عید و شمعِ شامِ مایوسی برابر شد

تم کاش وہی ہوتے!

اے کاش تم نہ جاتے خلوت سے خفا ہو کر
فردوسِ نظر بنتے تسکینِ وفا ہو کر
احساس سے دوری کے مغموم نہ ہوتا میں
جلووں کے تسلسل سے محروم نہ ہوتا میں

میں جذب تمھیں کر کے اپنے دلِ سوزاں میں
ہر وقت جلا سکتا اک شمعِ شبستاں میں

تم کاش چمن ہوتے! گل ریز و بہار افشاں
جب چاہتا بھر لیتا نظروں کا تہی داماں
ہر صبح تبسّم سے کچھ پھول بناتا میں
ہر شام کی محفل میں گلچیں نظر آتا میں

خوشبو سے بساتا میں ہر وقت دماغ اپنا

اور تم کو سمجھ لیتا مہکا ہوا باغ اپنا

تم کاش فلک ہوتے! معمور ستاروں سے
میں تم کو چھوا کرتا نظروں سے، اشاروں سے
ہر وقت جواں رہتا میرا دلِ ناکارہ
ہوتا نہ قیامت تک برہم مرا نظّارہ
جس وقت جہاں جاتا تم سامنے آجاتے
محدودِ نظر ہو کر آنکھوں میں سما جاتے

تم کاش ندی ہوتے قائم بھی خراماں بھی
مرکز سے گریزاں بھی مرکز ہی پہ رقصاں بھی
نظّارہ تماشا سے سیراب ہوا کرتا
ہر دم دل افسردہ شاداب ہوا کرتا
ہر وقت ہوا کرتی تزئین نگاہوں کی،
جب چاہتا کر لیتا تسکین نگاہوں کی،

تم کاش وہ ہی ہوتے جو میری تمنّا ہے
وہ پیشِ نظر رہتا جسکا مجھے سودا ہے

کندہ تمھیں کر لیتا میں دل کے نگینے میں
تم میرا نفس بن کر رہتے مرے سینے میں
یا جسم مرا ہوتے، یا روح مری ہوتے
جو کچھ میں سمجھتا ہوں، تم کاش وہ ہی ہوتے

محبّت

(سیاسی نقطۂ نگاہ سے)

خدا سمجھے قوانینِ جہانِ مادّیت کو غرضمندی کا اک آلہ بنا ڈالا محبّت کو
"محبّت خود غرض ہے، عشق ہے اک جوشِ نفسانی" نہ آئی شرم اس اعلان سے اہلِ سیاست کو
یہ تنقیدِ غلط ہی حسن کو بد ظن بناتی ہے سمجھتا ہے ہوس وہ جذبۂ اربابِ اُلفت کو
محبّت کی سیاست پوچھیے اُن ٹلنے والوں سے جو فرشِ خاک پر بیٹھے ہوں ٹھکرا کر حکومت کو
محبّت کونسل میں اور عدالت میں نہیں ملتی دلِ ویران میں ڈھونڈا اس ماہتابِ بزمِ فطرت کو
یہ ہے وہ علم جس کی عرش سے تعلیم ہوتی ہے سیاست خاک پہچانے محبّت کی حقیقت کو
فنائے روح ہے ذوقِ محبت کی گراں جوشی
ہے خود غرضی سیاست، اور محبّت خود فراموشی

سرگذشت

یاد ایا ہے کہ تھا عیشِ ازل میرے لئے زندگی تھی صبح کا تازہ کنول میرے لئے
کارفرما بے سکونی تھی نہ میرے ذہن میں میری ہستی نازشوں کا تھی محل میرے لئے

رنگ و بو سے بے نیاز
ما و تو سے بے نیاز
آرزو سے بے نیاز
جستجو سے بے نیاز

تھا نہ عالم ایک نامعلوم عالم کے سوا
کچھ نہ تھا اک نیند اور اک کیفِ پیہم کے سوا

ناگہاں اس نشہ سے مستی نئی پیدا ہوئی مستیٔ نوخیز سے ہستی نئی پیدا ہوئی
عالمِ بالا کی مجھ پر تنگ تھیں گنجائشیں دفعتاً میرے لئے پستی نئی پیدا ہوئی

رنگ خیز و بادہ بار
صد تماشا در کنار

ہر طرف کچھ لالہ زار

کوہسار و جوئبار

عشق کا دل محفلِ نو دیکھ کر للچا گیا

حسن کے رنگین ہونٹوں پر تبسم آگیا

"آن" سے اور "انس" سے ترکیب انسانی ہوئی
یعنی "حسن" و عشق کی وابستہ دامانی ہوئی

ہر طرف برپا ہوا اک محشرِ ناز و نیاز
کچھ نئے انداز سے تہذیبِ ویرانی ہوئی

حسن تھا گیسو بدوش

شورش و ہنگامہ کوش

عشق تھا وحشت فروش

بے نیازِ عقل و ہوش

گرمیٔ نظارۂ دنیا کا تجلی خانہ تھا

ہر کلی اک شمع تھی ہر پھول اک پیمانہ تھا

رنگ کیا لایا مرا سوزِ محبت، کچھ نہ پوچھ
میں ہلاکِ جلوہ ہوں میری حقیقت کچھ نہ پوچھ

بن گیا میرا سراپا اک جراحت ایک داغ
مجھ پہ کیا گذری، مآلِ کارِ وحشت کچھ نہ پوچھ

آج تک دیوانہ ہوں

بے خود و بیگانہ ہوں

عبرتِ ویرانہ ہوں

ہیبتِ افسانہ ہوں

"سرگذشت از من چہ پرسی بشنو از من سرگذشت"

"موئے سر از پا گذشت و خارِ پا از سر گذشت"

سایۂ زُہرا میں

فطرتاً جذباتِ حسن و عشق میں ہے ارتباط
ہے زمیں سے تا فلک ان کی بساطِ انبساط

جھومتا ہے عشق دل بنکر فضائے شوق میں
اپنی دُھن میں چھیڑتا ہے حسن جب سازِ نشاط

زحمتِ زنجیر ہے پائے حقیقت میں فضول
قیدِ ظاہر سے ہے بالاتر مذاقِ اختلاط

ختم ہو سکتی نہیں ان کی یہ جنگِ زرگری
شوق صَرفِ برہمی و عقل محوِ انضباط

رسم و آئین و تمدن کو ہوئی آخر شکست
سب نے جرأت آزمائی کی بمقدارِ بساط

عالمِ اجسام پر طاری ہوں کتنے ہی حجاب
روح کی دنیا نہیں پابندِ نظم و احتیاط

نیند کی غفلت سے جب اہلِ جہاں بیہوش تھے
سایۂ زُہرا میں حسن و عشق ہم آغوش تھے

مغالطہ

اکثر جمالِ شب میں دیکھی ہے صبح میں نے — اکثر ہوا ہے دھوکا ظلمت پہ چاندنی کا
اکثر مرا تصوّر تصویر بن گیا ہے — جب ذہن میں اُٹھا ہی طوفان بیخودی کا
دیکھی ہے آئینے میں سیرِ شب چراغاں — تیرا ہوں عکس بن کر تاروں کی روشنی کا
حسنِ اجل بکف کو تسکینِ روحِ جانا — جامِ شفق میں سمجھا سامان تشنگی کا
اپنی طرف کیا ہی شورش نے مجھ کو مائل — دے کر فریبِ باطل نغماتِ سرمدی کا
آیا نظر چمن کی مستی میں خوابِ ساغر — آنکھیں کھلیں تو رویا مُنہ چوم کر کلی کا
انسانیت سرابِ اُنس و خلوص نکلی — سمجھا تھا آدمی کو ہمدرد آدمی کا
مجبوریوں میں پایا رازِ نہانِ اُلفت — خود غرضیوں میں دیکھا انداز عاشقی کا
غازہ کبھی ریا کا سمجھا میں سادگی کو — رنگینیوں میں جھلکا آئینہ سادگی کا
آتا رہا نشاطِ دل پر یقین مجھ کو — زندانِ آب و گِل کو سمجھا میں گھر خوشی کا
برباد تر بتیں تھیں، تعبیرِ خوابِ ہستی — پایا اجل کدے میں احساس زندگی کا
کچھ شعبدۂ خودی میں، کچھ سحرِ بیخودی میں — کیا کیا مغالطے تھے اک خوابِ زندگی میں

شاعر کا دل

پھول کی خوشبو، شفق کی لَو، سحر کے نور سے　　نغمۂ ناہید سے ماہیّتِ کافور سے
ایک پیمانہ بنایا فطرتِ سرشار نے　　کردیا لبریز اُسے کیفیتِ مسرور سے
سوز کا اُس پر چڑھایا اک غلافِ تابناک　　اور پھر انسان کے پہلو میں پھینکا دُور سے

جس نے دیکھا آگ کا طوفاں سمجھ کر رہ گیا
آہ، شاعر اُس کی موجوں میں اُلجھ کر رہ گیا

پہلوئے "شاعر" میں دل آیا کہ دنیا آگئی　　خلوتِ تیرہ میں تنویرِ سویدا آگئی
عرش کی راہیں نگاہ و گوش پر کھلنے لگیں　　تا بہ لب الہام کی اک موج گویا آگئی
اُٹھ گئے حدِّ نظر تک چشمِ ظاہر سے حجاب　　سامنے لیلائے فطرت بے محابا آگئی

"شاعر" اس فطری عطائے خاص پر خوش ہوگیا
کیف وہ دل میں ہوا پیدا کہ سرخوش ہوگیا

اضطراب اُس پر ہوا طاری وطن کے درد سے　　ہوگیا وہ آشنا دشت و چمن کے درد سے
جا کے ویرانوں میں رویا تشنگی خار پر　　انجمن میں نالہ کھینچا، انجمن کے درد سے

پابگل فطرت کی نازک نے ایوّں کو دیکھ کر چیخ اُٹّھا کاوشِ سرو و سمن کے درد سے

کوئی جلوہ بھی نہ پھر باطل نظر آیا اُسے

سینۂ ہر ذرّہ میں اک "دل" نظر آیا اُسے

بزمِ حسن و ناز میں جب اُس نے چھیڑا اپنا ساز حُسن کی سنگینیوں میں کر دیا پیدا گداز

عشق کے ایواں میں رکھا اُس نے جب اپنا قدم غزنوی کے دل میں کھولا جادۂ زلفِ ایاز

قصّہ دیر و حرم کو ختم اُس نے کر دیا پاؤں پر ساقی کے سجدہ، دامنِ بُت پر نماز

صبح تک بھیگی ہوئی راتوں میں وہ روتا رہا

اُس کا دل جاگا کیا مرغِ سحر سوتا رہا

اے دلِ شاعر، منوّر قطرۂ نیسانِ عرش سینۂ شاعر میں تو ہی شعلۂ جولانِ عرش

تیرے ظرفِ فکر میں ہے وسعتِ کون و مکاں مختصر ترکیب تیری نقشۂ ایوانِ عرش

نغمۂ عریاں ترا، آبادیٔ دنیائے قدس جلوۂ پنہاں ترا شمعِ تہِ دامانِ عرش

عرش کی خلوت سے جب فطرت کا دل گھبرائیگا

عرش تیرا ہی دلِ ویراں بنایا جائیگا

نزاکتِ احساس

مرا احساس جو تاروں کی کرنوں سے بھی نازک ہے
جو نازک فکر شاعر کے خیالوں سے بھی نازک ہے
لطافت جس کی پچھلی رات کے پھولوں میں پلتی ہے
جو وقتِ صبح بوئے گل کی موجوں میں نکلتی ہے
گوارا اُس کو ہو گی چوٹ کیونکر نشترِ غم کی
حقیقت جو رگِ گل کی ہو، اور فطرت ہو شبنم کی
بقائے حسن اس عالم میں ہے احساس سے میرے
فروزاں زندگی کی آگ ہے انفاس سے میرے
مرا احساس آب و رنگ کی گرمی بڑھاتا ہے
جبینِ حُسن میں احساس میرا مسکراتا ہے
پذیرائی مرے احساس کی اے حُسنِ فانی کر
بسر اس کی پناہوں میں شبابِ زندگانی کر

مرے احساس میں تکمیلِ شانِ خود نمائی ہے
غلامی ہی مرے احساس کی، تیری خدائی ہے
مرے احساس کی تیزی کو تو تلوار سمجھا ہے
مرے احساس کو تو نشترِ پندار سمجھا ہے
تجھے شبنم پہ آتش ناک چنگاری کا دھوکا ہے
فرشتوں کے تصور پر سیہ کاری کا دھوکا ہے
غرض سمجھا ہے تو احساس کی رنگیں ہواؤں کو
کہانی جانتا ہے درد میں ڈوبی صداؤں کو
غلط اندیش، اک دل اور دل کے پاس پیدا کر
پھر اُس دل میں مذاقِ جذبۂ احساس پیدا کر
اگر تجھ کو مرے احساس کا احساس ہو جائے
تو دنیائے تمنا بے نیازِ یاس ہو جائے

رقصِ برگ

گلشنِ ہستی میں اے دیوانۂ موجِ ہوا
زہر سے لبریز ہے پیمانۂ موجِ ہوا

پھول جبتک شاخ سے اپنی جدا ہوتا نہیں
مبتلائے شورشِ موجِ ہوا ہوتا نہیں

متّحد جب تک ہیں تارے عالمِ افلاک پر
زندگی تاباں ہے ان کے دیدۂ ضوناک پر

جو مسافر کارواں سے اپنے آوارہ ہوا
وادیٔ غربت کا وہ بے نور سیّارہ ہوا

قصر سے جو خشتِ بے بنیاد باہر آگئی
اس سے نفرت کی زمیں نے خاک اس کو کھا گئی

ابر کی آغوش سے قطرہ جو نکلا بے قرار
گرمیٔ فطرت نے اسکو کر دیا جذبِ شرار

برگِ گل کے جی میں آئی تیتری کو دیکھ کر
"کاش میں بھی رقص کرتا سبزۂ شاداب پر

کاش آزادی مجھے بھی اسطرح ہوتی نصیب
منعقد کرتا میں اپنی بزم کلیوں کے قریب

تیتری کو دیکھ کر جذبوں میں اک جوش آگیا
شاخ کی پابندیوں سے دل مرا گھبرا گیا"

ناگہاں دستِ ہوا نے کر دیا رسوا اسے
صورتِ ذرّہ کیا گلشن میں آوارا اسے

یوں دیا فطرت نے اپنی عزم فہمی کا ثبوت　　کر دیا اس پر مسلّط ایک تارِ عنکبوت
تار میں وہ برگِ گل کچھ دیر تک جھولا کیا　　سرخوش و آزادِ دُنیا کی ہوا دیکھا کیا
بادِ صرصر نے گرایا آخر اس کو خاک پر　　موت غالب آ گئی اس کی ہستیٔ بیباک پر
ٹھوکریں کھاتا رہا وہ شوخیٔ رہگیر کی　　مسکرائیں پستیوں پر رفعتیں تقدیر کی
چاہتا تھا جست پھر اک جانبِ بالا کرے　　برگ جو شاخوں میں تھے، سب کھلکھلا کر ہنس پڑے
اپنے مرکز تک اُسے پرواز کی جرأت نہ تھی　　قوّتِ نشو و نما اب جزوِ ماہیت نہ تھی
روح نکلی، رنگ بدلا، تازگی کُملا گئی　　دیکھتے ہی دیکھتے پتّے کو مٹّی کھا گئی
اب نہ تھا وہ رقص اسکا، اب وہ آزادی نہ تھی　　موت بن کر چھا گئیں انجام کی بربادیاں
دفعتاً آندھی اُڑا کر خاک اُس کی لے گئی　　بن کے گردش، آرزوئے رقص دھوکا دے گئی

اپنے مرکز سے جدا ہو کر جو ٹھوکر کھائے گا　　وہ یونہی اک روز دُنیا میں فنا ہو جائے گا
قوّتِ کامل ہیں اس دُنیا میں ربط و اتحاد　　ان کی قوّت پر ہوا کرتا ہے قوموں کا جہاد

ہے اگر ثابت قدم، تقلیدِ سیّارہ نہ کر
رقصِ آزادی کی دُھن میں خود کو آوارہ نہ کر

حسنِ آوارہ

تو سمجھتا ہے کہ آوارہ ہے شبنم کا مزاج　　ہے شعاعِ مہرِ رنگِ صبح رسوائے چمن
نکہتِ سیّارہ ہے اک موجۂ حرص و ہوا　　ہے شمیم اک خندۂ بے جائے مینائے چمن
روشنیٔ صبح، عالم دوست ہے ہرجائی ہو　　جو برستی ہے افق سے تا بہ پہنائے چمن
تو سمجھتا ہے یہ غنچے اور یہ رنگین پھول　　تاجرانِ رنگ و بو ہیں بہرِ دنیائے چمن
تو سمجھتا ہے نسیم اک فتنۂ تخریب ہے　　مائلِ مشاطگی و خلوت آرائے چمن
ہے یقیں تجھ کو کہ ہر رنگین نازک تیتری　　ہے تقاضائے ہوس سے رقص فرمائے چمن
تجھ کو باور ہے کہ ہر وہ چیز جس میں حسن ہو　　ہے حیا سوز ایک نقشِ رنگ پیرائے چمن

چاندنی ہے دھوپ ہے جگنو ہے یا سیّارہ ہے
تیری نظروں میں یہ ہر معصومیت آوارہ ہے

تیرے اس احساس سے بالا ہے ادراکِ جمال　　باطن آرائے گل و لالہ ہے نزہت حسن کی
ساری جنت کا اچھوتا پن ہے نفسِ حسن میں　　حور کی عصمت سے ہے ماخوذ عصمت حسن کی
حسن اپنے کیف میں خود بے خود و سرشار ہو　　فطرتاً کیوں کر بہک سکتی ہے نیت حسن کی

حسن ہے عینِ حقیقت، حُسن ہے عینِ خدا
جو سرشتِ روح ہے وہ ہے طبیعت حُسن کی

عشق نے پیدا کیا ہے اسکے دل میں انتشار
تازہ پھولوں سے بھی نازک تھی لطافت حُسن کی

کھینچتا ہے عشق اس کو پردہ ہائے راز سے
ورنہ ہے ادراک سے بھی دور خلوت حُسن کی

جس میں ہو آوارگی وہ حُسن ہو سکتا نہیں
یعنی ہے "سرمایۂ محفوظ" دولت حُسن کی

حُسن کہتا ہے کہ رسوا عشق کا نظارہ ہے
عشق کہتا ہے کہ فطرت حُسن کی آوارہ ہے

تخریب

شورشِ تخریب میں ہے عقل انساں کی خراب
آ بتادوں میں تجھے تخریب کا لُبِّ لُباب

رازِ بربادی نئی تہذیب نے سمجھا نہیں
علم اور ادراک ابھی اس کا ہے محدودِ کتاب

جتنی فانی لذتیں ہیں اس جہانِ خواب کی
انحطاط اُن کا نتیجہ ہے، مآل اُن کا عذاب

محترز انسان اگر لذاتِ ناقص سے رہے
ہو رہا قیدِ فنا سے مثلِ ماہ و آفتاب

کامیابی فی الحقیقت آرزو کی موت ہے
ہے وہ ہی ناکام جس کی آرزو ہی کامیاب

کامگاری ہی بہ الفاظِ دگر تخریب ہے
حاصلِ ہر لذّتِ نفس و نظر تخریب ہے

صبح کا چاند

پھینک کر دُنیا پہ زنجیرِ طلائی رات بھر
کر کے بحر و دشت میں جلوہ نمائی رات بھر

جگمگا کر ساری دنیا کو شعاعِ نور سے
اور پھیلا کر ضیا اپنے چراغِ دور سے

بحر کی موجوں کو دیکر اذنِ جوشِ ارتعاش
جذب کر کے نہر میں اپنا جمالِ نور پاش

بیٹھ کر تاروں کی محفل میں سحر تک بے نقاب
سطحِ عالم پر بہا کر اپنی کرنوں سے شراب

پا شکستہ قافلے کو تا بہ منزل چھوڑ کر
پھول کے سینے میں اک تڑپا ہوا دل چھوڑ کر

چاندنی کے پھول کو دے کر جوانی نور کی
آگ برسا کر زمیں پر آسمانی نور کی

دفعتاً مدھم ہوئی کیوں تابشِ کامل تری؟
یک بیک خاموش کیوں ہونے لگی محفل تری؟

کیوں ترا پیمانۂ رنگیں چھلک کر رہ گیا؟
کیوں یہ تیرا شعلۂ زریں بھڑک کر رہ گیا؟

رات بھر تو ظلمتوں پر عطر برساتا رہا
شوخیاں کرتا رہا۔ ہنستا رہا۔ گاتا رہا

صورتِ شمعِ سحر کیوں رنگ ہی پھیکا ترا
لے گئیں کس کی نگاہیں چھین کر جلوا ترا؟

ساغرِ تاباں ترا کیوں رہ گیا ہے ٹوٹ کر
کیا تو واماندہ ہے اپنے کارواں سے چھوٹ کر؟

غالباً بیدار کوئی جلوۂ معصوم ہے
جس کے نظارے سے تیری روشنی معدوم ہے

خواب سے لیتا ہوا انگڑائی اٹھا ہے کوئی
دیکھ کر آئینہ تیرا مسکرایا ہے کوئی

ہے اثر سے حسن کے شرمندۂ محجوب تو
اسلئے موجِ ندامت میں گیا ہے ڈوب تو

یا جو شعلہ سا ہوا ہے جانبِ مشرق بلند
اس کی گرمی سے ہوا ہے تیرا چہرہ کسل مند

اے کہ تو اک پیکرِ بے نور آتا ہے نظر
لے گیا کوئی تری روحِ حقیقت کھینچ کر

ہے فنا انجام تو جیسے بہاریں باغ کی
غیر فانی ہے چمک میری جگر کے داغ کی

اب میں سمجھا کیوں تری ہستی زوال اندوز ہے
تو سراپا ساز ہے اور دل سراپا سوز ہے

شہابِ ثاقب

دراز دستیٔ گلچین و موجِ شوخِ ہوا
چمن سے ہستیٔ گل کو کوئی مٹا نہ سکا

شکستِ جام و سبو کو ملی حیاتِ جدید
جہانِ میکدہ میں انقلاب آ نہ سکا

ستارہ ٹوٹ کے بکھرا ہو گیا فروغِ نظر
چراغِ بزمِ فلک کے کوئی بجھا نہ سکا

مگر ستم کشِ شبہائے غم کے پہلو میں
وہ دل جو ٹوٹ گیا پھر نمود پا نہ سکا

شگفتِ خاطرِ برہم زدہ در امکاں نیست
دلِ شکستہ و نجمِ شکستہ یکساں نیست

۱۳ ھ ۵۲

اے چراغِ بزمِ دوشیں کی ضیائے آخری — گلشنِ دہلی کی اے رنگیں صدائے آخری
آہ کس منہ سے کہوں تو خاک میں خوابیدہ ہے — سامنے نظروں کے تیرا پیکرِ کاہیدہ ہے
گھل گیا سوزِ دروں سے شمعِ سوزاں کی طرح — رخصت آخر ہو گیا دودِ پریشاں کی طرح
داغِ نوارِ دو کے صد پارہ جگر کو دے گیا — آہ اپنا رنگ بھی تو ساتھ اپنے لے گیا
فلسفہ اب سادہ تر لفظوں میں سمجھائیگا کون؟ — اب بساطِ انجمن پر پھول برسائے گا کون!
نغمہ بیزارِ رباب و چنگ ہے تیرے بغیر — بزمِ اردو مطلقاً بے رنگ ہے تیرے بغیر
اہلِ عالم کو نوا تیری صلائے عام تھی — جنبشِ لب ترجمانِ عقدۂ الہام تھی
گیسوئے اردو کی اب مشاطگی ممکن نہیں — اور سب باتیں تو ممکن ہیں، یہی ممکن نہیں
بزمِ داغ و محفلِ غالب خیابانِ نذیر، — سب کی رونق تجھ سے تھی اے یادگارِ سوز و میر
ذہنِ شاعر کی ودیعت، عشق کے سینے کا راز — حسن کی پنہاں حقیقت، کیف و کم کا امتیاز
تھی امیں ان سب خزانوں کی تری فکرِ بلند — شوخیاں کرتی تھی بامِ عرش سے جسکی کمند

قلزمِ تحقیق میں بہتا چلا جاتا تھا تُو
تہہ سے طوفانوں کی، موتی ڈھونڈھ کر لاتا تھا تُو

سخت عنوانوں پہ دل میں چبھنے والے حاشئے
سینکڑوں نظموں سے بہتر، چار ٹکڑے نثر کے

آہ، وہ اردو میں وارفتہ نگاری اب کہاں؟
حُسن کی لَے میں حدیثِ بیقراری اب کہاں؟

اے مسافر، ہو ترا اللہ ناصر، الوداع
اے جہانِ آباد کی آوازِ آخر، الوداع

فلسفۂ زوال

نہ ہو افسردہ خاطر انقلابِ بزمِ امکاں سے
یہاں صحرا ہمیشہ بنتے آئے ہیں گلستاں سے

فنا ہے ایک عالم کی بقائے عالمِ دیگر
بنائے قصر ہے تاراجیٔ ریگِ بیاباں سے

چمن میں آبروئے رنگ ہیں آنسو ستاروں کے
نمودِ لالہ و گل ہے سرشکِ ابرِ باراں سے

زوال اک باطنی تمہید ہے آثارِ رفعت کی
حدودِ شامِ ہم آغوش ہیں صبحِ درخشاں سے

غمِ واماندگی کو فرصتِ آرام ملتی ہے
فضا پھر گونجتی ہے کاروانِ خفتہ ساماں سے

خطِ ہستی پہ چلنا، نقطۂ آخر سے لوٹ آنا
یہ جادہ رات دن پُر شور ہے رفتارِ انساں سے

زوال اک ساعتِ تزئین ہے فکرِ ارجمندی کی
نہ ہو پستی تو پھر تمیز کیونکر ہو بلندی کی

شاعر کی موت

موت تو انسانِ فانی کے لئے قانون ہی
فطرتِ شاعر بقائے خاص کی ممنون ہی

نفسِ شاعر فطرتاً نقشِ فنا پیرا نہیں
یعنی اسکی زندگی میں موت کا جھگڑا نہیں

زندگی اس کی نشاطِ روح کی تفسیر ہے
موت اسکے محو ہو جانے کی اک تصویر ہے

زندگی میں مرحلے طے موت کی کرتا ہی یہ
سینکڑوں بار اس فنا آباد میں مرتا ہی یہ

"موت قبلِ موت" اسکا مسلکِ دیرینہ ہی
روح اسکی آئینہ، یہ جوہرِ آئینہ ہی

زندگی بنتی ہے اسکے مبدءِ افکار سے
بھاگتی ہے موت اسکی ایک ہی للکار سے

عمر بھر دیتا ہے یہ دُنیا کو پیغامِ بقا
عالمِ فانی میں کرتا ہے سرانجامِ بقا

آ کے جس منزل پہ مر جاتا ہی ہر سرمایہ دار
زندگی شاعر کی کرتی ہی وہاں آغازِ کار

سطوتِ شاہنشہی تھک کر ٹھہرتی ہی جہاں
کارواں شاعر کا اس نقطے سے ہوتا ہی رواں

ماند پڑتی ہے جہاں ذہنِ مصور کی تپش
آگ بنتی ہے وہاں سے فکرِ شاعر کی روش

چند صدیوں تک کوئی انسان پا سکتا ہی نام
زندگی کو ہے مگر شاعر کی احیائے دوام

کاوشِ یک عمر سے جب ذہن ہوتا ہے خراب
فطرتاً ہوتا ہے شاعر مائلِ مجبورِ خواب

ڈھونڈتا ہے پُرسکوں اپنے لئے اک خوابگاہ
چھپ کے چشمِ خلق سے لیتا ہے تربت میں پناہ

موت خود کرتی ہے اس کا اہتمامِ زندگی
اُس کو شہرت بن کے دیتی ہے پیامِ زندگی

گونجتی رہتی ہے اُسکی بزمِ عالم میں صدا
خامشی دیتی ہے اُس کے ساز کو رنگِ نوا

مسکراتا ہے وہ اپنی نظمِ گوہربار میں
رمز کر لیتا ہے باتیں پردۂ اشعار میں

خونِ دل اُسکا برستا ہے شفق کے رنگ پر
وہ نئے نغمے سُناتا ہے سحر کے چنگ پر

شام کو ہوتا ہے روشن اُسکا فانوسِ خیال
رات کی ہیبت سے ہوتا ہے عیاں اُسکا جلال

برق بن کر ابر میں رقصاں نظر آتا ہے وہ
رنگ بن کر پھول میں پنہاں نظر آتا ہے وہ

روح اُسکی وادیوں میں اینڈتی ہے شعرخواں
اُس کی اک آواز ہوتی ہے درائے کارواں

درس دینے کے لئے ہر رنگ میں آتا ہے وہ
زندگی بن کر بھری محفل پہ چھا جاتا ہے وہ

محشرِ ہستی میں شاعر دائمی اک صور ہے
جس کو کہتے ہیں فنا، وہ اس سے کوسوں دور ہے

ہاں مگر آتا ہے اُس پر ایک وقتِ ناگوار
جب وہ اپنے ذہن میں محسوس کرتا ہے فشار

ٹوٹتا ہے رشتۂ الہام اُس کے ساز سے
دُور ہو جاتا ہے وہ پردہ سرائے راز سے

تنگ ہو جاتی ہیں اُس پر وسعتیں تخئیل کی
سُن نہیں سکتا صدائیں شہپرِ جبریل کی

کیف سے محروم ہو جاتا ہے جب مینائے دل　　جلوہ کش ہوتی نہیں جب گرمیِ سینائے دل

روح میں جب اُس کی سامانِ طرب ہوتا نہیں　　شعر موزوں باوجودِ فکر، جب ہوتا نہیں

جب نظر آتا ہے وہ بے چین سا بیتاب سا　　اور ہو جاتا ہے آنکھوں پہ مسلّط خواب سا

دل کی بیداری کو ہو جاتا ہے خطرہ فوت کا
بس وہ ہی لمحہ ہے شاعر کی حقیقی موت کا

غالب

ایک تو رازِ "بقا اندر فنا"، فہمیدہ ہے　　بے نوا ہو کر حجابِ خاک میں خوابیدہ ہے

محو ہے شاید کسی مضمونِ نو کی فکر میں　　تیری خاموشی بھی ہے اک شعرِ گو پیچیدہ ہے

اے ستم پروردۂ آب و ہوائے "ارضِ تاج"　　مدتیں گذریں کہ تو دہلی میں آرامیدہ ہے

آج تیری آگ سے معمور ہے تیرا وطن　　تیرے ہی سوزِ صدا سے اُسکا دل تفتیدہ ہے

روح بن کر تو ہے بزمِ شعر پر چھایا ہوا　　رنگ تیرا دیدہ ہے، صورت تری نادیدہ ہے

ذہنِ شاعر کو تصور سے ہیں تیری رفعتیں　　فکرِ افسردہ تصرف سے ترے بالیدہ ہے

تیری موجِ فلسفہ اُردو پہ غالب ہو گئی
دوشِ مشرق قابلِ گیسوئے مغرب ہو گئی

میرے احساسات تو کیا پوچھتا ہے ہم نشیں   حُسن میں اور عشق میں کوئی توازن ہی نہیں
وہ اُدھر مصروفِ سیرِ لالہ و گُل باغ میں   میں اِدھر تاریکیِ خلوت میں افگندہ جبیں
وہ اُدھر محوِ تماشائے بہارِ زندگی   میں اِدھر جذبات کی کاوش سے مرنے کے قریں
وہ اُدھر رنگیں لبوں سے انجمن میں رنگ بار   میں اِدھر خاموش، بیدل، بیقرار، اندوہگیں
وہ اُدھر بھولے ہوئے رسمِ وفا وعدے کے بعد   میں اِدھر احساسِ وعدہ سے مجسّم اک یقیں
وہ اُدھر سرمستیوں سے، صد بہار و صد نشاط   میں اِدھر نالہ بلب اور چشمِ تر بر آستیں
وہ اُدھر اپنی خودی کے زعم میں آزاد رَو   میں اِدھر اُن کی پرستش کے لئے گوشہ گزیں
وہ اُدھر میرے خیالِ مضطرب سے بے نیاز   میں اِدھر اُن کے تصور میں پریشان و حزیں
وہ اُدھر جوشِ مسرّت کی فضا میں نغمہ گر   میں اِدھر زحمت کشِ طوفانِ آہِ آتشیں
وہ اُدھر مغرور، سرخوش، سربلند و سرفراز   میں اِدھر عجز و نیازِ دل سے پیوندِ زمیں
وہ اُدھر بیگانگی کا ایک نقشِ بدنما   میں اِدھر حُسنِ وفا کا شاہکارِ بہتریں

وہ اُدھر دُنیا سے مصروفِ گناہِ التفات
میں اِدھر اُن کی ہوا میں فارغِ دُنیا و دیں

وہ اُدھر لاکھوں اداؤں سے کہیں محوِ خرام
میں اِدھر دو منتظر آنکھوں سے حسرت آفریں

حُسن کے اور عشق کے عالم میں کتنا فرق ہے
ایک پھولوں کا تبسم، ایک موجِ برق ہے

شہرت اور موت

موت کو اجزائے ہستی پر ملا جب اختیار
دولت و شہرت کو بھی اس نے کیا اپنا شکار

عالمِ فانی کی، دولت ایک فانی چیز تھی
موت کا جھونکا جو آیا، اُڑ گئی مثلِ غبار

شہرت اس دُنیا کی تھی دراصل نصفِ زندگی
اُس نے جب دیکھا کہ ہے خطرے میں ننگِ اقتدار

بوئے گُل بن کر حجابِ گُل میں پنہاں ہو گئی
اور جب چاہا ہوئی موجِ ہوا سے آشکار

موت کی جاذب نگاہیں جب نہ اُسکو پا سکیں
ہر روش سے کر دیئے پیدا ہزاروں انتشار

حاملِ شہرت کو جب اُس نے ملایا خاک میں
شہرت اُس پر چھائی آ کر صورتِ ابرِ بہار

موت کے منھ سے شہیدوں کو مبارکباد دی
سرفروشوں کی لحد پر بن گئی شمعِ مزار

سعیِ شہرت کر، کہ ممکن موت شہرت کو نہیں
موت کو شہرت ہے، لیکن موت شہرت کو نہیں

آہ، یہ قہقہہ!

طلوع کون یہ ہوا، صنم کدے سے صبح کے — جبینِ مرمریں میں شمعِ بتکدہ لئے ہوئے

جگائے چتونوں میں اپنی ایک سحرِ حسن کا — نظر میں تجلیاں، لبوں میں زمزمہ لئے ہوئے

خرام، آہ وہ خرام، جو ہے پائے ناز سے — دلوں کی پائمالیوں کا فیصلہ لئے ہوئے

قدم قدم پر ایک فتنۂ قیامت آفریں — نقوشِ پا صد آئینہ درِ آئینہ لئے ہوئے

جمال میں بھرے ہوئے ہزار درسِ عاشقی — خیال میں مسرتِ مطالعہ لئے ہوئے

وہ بال، جن پہ اپنی جان ابرِ نوبہار دے
وہ چال جو نگاہ کو پیامِ انتشار دے

جبیں پر ایک احمریں ستارۂ آفتِ نظر — وہ قہقہہ جس پہ رنگ کفرِ حسن کا چڑھا ہوا

حریمِ دیر میں لطیف شمع سی جلی ہوئی — سمن کدے میں اک شگوفۂ حسیں کھلا ہوا

خرامِ مست کی وہ اسکے شوخیاں بڑھی ہوئی — وہ ذوقِ سرخوشی مری نگاہ کا بڑھا ہوا

کنکھیوں سے وہ بار بار اُس کا مڑ کے دیکھنا — حجابِ احتیاط میری آنکھ پر پڑا ہوا

نہ سیرِ حسرتِ نظر، نہ پرسکونِ رہگذر — جو یوں ہوا تو کیوں ہوا۔ جو یہ ہوا تو کیا ہوا

قریبِ صبح خوابناک عشرتِ نظر تھی یہ — سمجھ لیا کہ مختصر عبادتِ سحر تھی یہ

حسنِ مجبور

حصۂ انساں ہے سوز و ساز کے سامان میں — حسن بھی انسان میں ہے عشق بھی انسان میں

قلبِ گیتی عشق کے پر تو سے آتش ناک ہے — حسن کی رنگینیوں سے گل بداماں خاک ہے

عشق سے ہوتی ہے نور افروز شامِ کائنات — جاگتا ہے حسن سے گل خانۂ صبحِ حیات

چھیڑ کر فطرت نے اپنا سازِ جبر و اختیار — بھر دیا انسان میں مجبوریوں کا انکسار

عشق نے مجبوریوں کی بے کسی محسوس کی — جذبۂ وارفتگی پر چوٹ سی محسوس کی

دفعتاً ہستی کی پابندی سے ہو کر بے نیاز — نالہ وہ کھینچا، لرز کر رہ گئی بزمِ مجاز

خون وہ رویا کہ اک عالم کفِ سیلاب تھا — شعلہ وہ پھینکا، جو برقِ خرمنِ اسباب تھا

عشق عالم سوز قیدِ جبر سے گھبرا گیا — جست کی ایسی کہ فطرت کو پسینہ آگیا

بے خودی و محویت کی وسعتوں میں کھو گیا — شوق کی قوت سے آزادِ تعین ہو گیا

حسن نے آنکھیں جھکا کر کیں یہ زنجیریں قبول — بڑھ گیا افسانۂ رنگیں میں عنوانِ فضول

جان ہے مشکل میں حسنِ مشکلات آگاہ کی — ہر قدم پر ایک مجبوری ہے ٹھوکر راہ کی

عشق آزاد، اور مجرد رہ اسم پائے حسن حسن خود توہین ہے اپنے لئے اے وائے حسن!
کاش فطرت غور کرتی حسن کی تقسیم میں اک توازن کاش ہوتا دہر کی تنظیم میں
حسن اُسے ملتا جو لذت آشنائے عشق تھا جس کا دل دُنیا میں فطرت آشنائے عشق تھا
حسن اُسے ملتا جسے آزادیاں ہوتیں نصیب ہر قدم پر کائنات ایجادیاں ہوتیں نصیب
حسن اُسے ملتا نہ ہوتا جو علائق کا غلام توڑ سکتا جو رواج و رسم کی قیدیں تمام
حسن اُسے ملتا جسے ہوتی محبت کی تلاش اور جس کی روح کو ہوتی حقیقت کی تلاش
حسن محوِ احتیاط و عشق آزادی شعار ذوقِ حسن و عشق میں ہے اختلافِ ناگوار

اے محبت، عشق کے دل سے یہ کاوش دور کر
حسن کو آزاد رہنے کے لئے مجبور کر

نویدِ فردا

اے کہ تیرا حسنِ سادہ، صبح درآغوش ہے
اے کہ تیرا دل وفاگستر، محبت کوش ہے

میکدے لاکھوں تری تمکیں نگاہی پر نثار
تیری آنکھوں میں نیا اک بادۂ سرجوش ہے

نغمہ پیرا ہے نوائے عرش تیرے ذہن میں
بر بطِ الہام تیری فطرتِ خاموش ہے

ہے بقدرِ ظرف حصہ کیف باقی میں ترا
تو مرے میخانۂ اسرار کا مے نوش ہے

تجھ سے آسودہ ہے بے کیفی مرے جذبات کی
تیرا آب و رنگ تسکینِ خمارِ دوش ہے

چاند ہے تو آرزو کے آخری لمحات کا
تو اُجالا ہے مری محفل کی پچھلی رات کا

عالمِ باطل میں تجدیدِ حقیقت تجھ سے ہے
خود غرض دُنیا میں تائیدِ محبت تجھ سے ہے

تو نے ناموسِ وفا کو اپنے دل میں دی پناہ
رسم و آئینِ صداقت کی حفاظت تجھ سے ہے

یہ سلیقہ، یہ سعادت، یہ متانت، یہ شعور
بزمِ انساں میں وقارِ آدمیت تجھ سے ہے

ماورائے آرزو نکلا ترا کیفِ جمیل
سادگیہائے تمنا کو ندامت تجھ سے ہے

تیرا باطن ضو فشاں ہے تیرے ظاہر کی طرح
رنگِ خلوت تجھ سے ہے تزئینِ جلوت تجھ سے ہے

کون ہے تو، یہ ابھی کوئی بتا سکتا نہیں
تیری ہستی کا سمجھ میں راز آ سکتا نہیں

ہے نویدِ عہدِ آئندہ تجھے اے نورِ جاں
حال تیرا کیف آور تیرا مستقبل جواں

اُس فضا میں جو ابھی دنیا کی نظروں سے ہے دُور
ہے تکلم اب بھی تیرا نغمہ ریز و نغمہ خواں

دیکھیے کیا رنگ لائے تیری فطرت کی ضیا
جب تری آغوش میں خورشید ہو طلعت فشاں

اب بھی تیری ہر نظر ہے کامیابی کی کرن
اب بھی ہیں تیری جبیں میں صبحِ منزل کے نشاں

اک تڑپ بیدار ہے پردوں میں تیری ساز کے
گونجنے کو ہے تری آواز سے بزمِ جہاں

عظمتِ باقی تری مستحکم و پائندہ ہے
تیرا مستقبل ستاروں کی طرح تابندہ ہے

شاعر کی تربت

جنگل بیاباں ظلمت بداماں
شاعر کا مدفن اُسمیں فروزاں
پژمردہ اک پھول اک شمع لرزاں
خاموش منزل ماحول ویراں
ٹوٹا سا کتبہ لیکن غزل خواں

پُرہول منظر
لیکن نواگر

اللہ اکبر! اللہ اکبر!

کیا تازگی ہے کیا دلکشی ہے
اک زندگی سی چھائی ہوئی ہے
ہے خوابِ راحت یا بےخودی ہے
یہ بےخودی بھی بیدار سی ہے

مر کر ہو زندہ شاعر وہی ہے
سنگِ لحد پر
تاروں کی چادر
راتیں منوّر باتیں معطّر
حسرت کے پیکاں جذبِ رگِ جاں
نظروں میں اب تک شبہائے ہجراں
سینے میں اب تک روشن چراغاں
ہے بے کسی کا عالم نمایاں
پھر بھی لحد ہے فردوسِ خنداں
جلووں کا خرمن
جذبوں کا مخزن
یا بزمِ ایمن! شاعر کا مدفن!
الہام زادہ ہے سرفتادہ
موجِ فنا سے سرشارِ بادہ
فرصت ملی ہے کل سے زیادہ

لکھے کفن پر — ہے یہ ارادہ
اک نظمِ رنگیں — اک شعرِ سادہ

اک سطرِ عبرت
نقشِ حقیقت

لوحِ محبّت! — شاعر کی تربت!

پھر اُٹھ کھڑا ہو — شورش فزا ہو
تربت سے اپنی — جلوہ نما ہو
دشت و چمن میں — نغمہ سرا ہو
پھر تجھ سے دُنیا — درد آشنا ہو
پھر صورِ ہستی — تیری نوا ہو

ہیں تیری خاطر
سُونے مناظر

جاگ اے مسافر! — اُٹھ میرے شاعر!

حسن کا آخری حربہ

آہ، اے وعدہ خلاف، اے بے مروت، بے وفا
تو نے استغنا سے میرے دل کو برہم کر دیا

کیوں نہ ہو وحدت پرستیٔ محبت کو ملال
میرے ہوتے ماسوا کا جب ہی تجھ کو خیال

محو میں تیرے تصور میں رہوں شام و سحر
اور میرے ذوقِ پیہم کی نہ ہو تجھ کو خبر

شام سے مجھ کو رہے خلوت میں تیرا انتظار
اور تو ہو بے وفا، مصروفِ سیرِ سبزہ زار

بے نیازی نے تری دل کو مرے تڑپا دیا
آتشِ پہلو کو دوزخ کی طرح بھڑکا دیا

میں ترا جاں سوختہ ہوں، مجھ سے بے پروا ہی تو -
جانتا ہے خوب میرا دل تجھے جیسا ہے تو

عشق کی غیرت سی شاید تو ابھی واقف نہیں
جذبۂ نفرت سے تیری سادگی واقف نہیں

تیرے گلزارِ جمال و حسن کا گلچیں ہوں میں
تیرے پہلو کی، تری آغوش کی تزئیں ہوں میں

ہوں تری رنگیں اداؤں کے مزے لوٹے ہوئے
شوق کے شیشے لبوں پر ہیں ترے ٹوٹے ہوئے

کر چکا ہوں جذب تجھ کو اپنے دل کے جوش میں
مدتوں بے بس رہا ہے تو مری آغوش میں

اب بھی گر تجھ کو مری قدرِ وفاداری نہیں
صاف کہتا ہوں کہ جان اپنی مجھے بھاری نہیں

دل جو استعفائے الفت کے لئے مجبور ہے
تجھ سے اب ترکِ تعلق مطلقاً منظور ہے

ہ، اے آرامِ دل، اے غمگسارِ اضطراب — یک بیک کیوں آ گیا فطرت میں تیری انقلاب
یا ہوا، تر ہو گئی کیوں تیری چشمِ نازنیں — اللہ اللہ! حسن بھی مغموم ہوتا ہے کہیں؟
ہ، یہ اشکِ مسلسل، یہ گرانباری تری — پھر فریبِ لطف دیتی ہے نگوں ساری تری
س ترے احساس نے شکووں کا پہلو کھو دیا — تیرے اشکوں نے غبارِ دل کو یکسر دھو دیا
کیوں نصیبِ دشمناں ہوں تیری آنکھیں اشکبار — ایک آنسو پر ترے لاکھوں ستارے ہوں نثار
نرگسِ پُرنم نے تیری قلب کو لرزا دیا — شعلۂ غم پر مرے اک ابر سا برسا دیا
یہ تری افسردگی کیا قابلِ برداشت ہے؟ — آخری حربہ ترا ناقابلِ برداشت ہے
آ، لبوں میں اپنے کر لوں جذب یہ موتی ترے — آہ یہ شبنم کے قطرے پھول پر ڈھلکے ہوئے!
آ میں آنکھیں اپنی تیری چشمِ پُرنم سے ملوں — آ میں اپنے شوق کے دامن سے آنسو پونچھ دوں
خوش ہو استعفائے الفت میں نے واپس لے لیا — خطبۂ ترکِ محبت میں نے واپس لے لیا
آ پھر اپنے قول اور اقرار کی تجدید کر — مسکرا کر میری شامِ غم کو صبحِ عید کر

پھر وہی تو ہے وہی مجھ کو وفا سے کام ہے
تیرا ہر آنسو محبت کا نیا پیغام ہے

میرا ہم خرامِ شب

رات کو جب اضطرابِ دل سے گھبراتا ہوں میں
کُنجِ خلوت چھوڑ کر تنہا نکل جاتا ہوں میں

ہُو کا اک عالم نظر آتا ہے ہر جانب مجھے
خوف سے لبریز سناٹے میں تھراتا ہوں میں

چاہتا ہوں کوئی تنہائی میں میرا ساتھ دے
وسعتِ عالم میں اپنا ذہن دوڑاتا ہوں میں

پھُول خوابیدہ نظر آتے ہیں بلبل پر سکوت
جگنوؤں کو نیند کی آغوش میں پاتا ہوں میں

بزمِ حسن وناز پہ ہوتے ہیں گوناگون حجاب
خواب گاہِ دوست تک جاتا ہوں لوٹ آتا ہوں میں

رحم کوئی میرے حالِ زار پر کھاتا نہیں

اور تاریکی میں لاکھوں ٹھوکریں کھاتا ہوں میں

کون اس تنہائی میں میرا شریکِ راہ ہو
بے محل آوارگی سے اپنی شرماتا ہوں میں

میں کبھی اک آہ بھر لیتا ہوں سینہ تھام کر
زیرِ لب نغمہ محبت کا کبھی گاتا ہوں میں

جب زمیں خالی سکوں سے مجھ کو آتی ہے نظر
جانبِ گردوں نگہ کی گود پھیلاتا ہوں میں

زرد رنگ اک دیدۂ بے خواب آتا ہے نظر
رات کی آغوش میں مہتاب آتا ہے نظر

منزلوں اس کی رفاقت میں گذر جاتا ہوں میں
یہ بھی میرے ساتھ جاتا ہے، جدھر جاتا ہوں میں

تیرتا ہے یہ بھی میرے ساتھ موجِ آب پر
جب لگی دل کی بجھانے نہر پر جاتا ہوں میں

روشنی اس کی بڑھا دیتی ہے محویت مری
جھولتا کرنوں میں تا حدِّ نظر جاتا ہوں میں

نغمۂ خاموش اپنا یہ سناتا ہے مجھے
جب سر افگندہ میانِ رہگذر جاتا ہوں میں

دیکھتا ہوں اس کو اپنے سامنے ٹھہرا ہوا
شدتِ واماندگی سے جب ٹھہر جاتا ہوں میں

دور تک آئینہ بن جاتی ہے صحرا کی فضا
صورتِ دیوانۂ حیرت نگر جاتا ہوں میں

یہ نہ ہو ہمراہ تو اک گام چلنا ہو محال
دل بر آتش، جاں بلب، سودا بسر جاتا ہوں میں

میرے اور اس کے سوا رہرو نہیں ہوتا کوئی
چلتے چلتے اپنے سائے سے بھی ڈر جاتا ہوں میں

یہ مجھے پہونچانے آتا ہے درِ کاشانہ تک
خلوتِ تاریک میں جب لوٹ کر جاتا ہوں میں

کیوں نہ شاکر ہو جنونِ ناتمامِ شب مرا
ہے رفیقِ بے کسی یہ ہم خرامِ شب مرا

شاعر کا نغمہ

(عالمِ ارواح سے)

اے جہانِ فانی کی خاک چھاننے والو
اے فریبِ عشرت کو عیش جاننے والو

اک پیام تو لے کر میں بھی تم میں آیا تھا
اک صحیفۂ موزوں اپنے ساتھ لایا تھا

کوہ و دشت کو میں نے جب دیا پیام اپنا
سب نے مجھ کو پہونچایا عجز سے سلام اپنا

مختلف صداؤں سے لالہ زار میں گونجا
میں خزاں میں خوں رویا، میں بہار میں گونجا

سوز کر لیا حاصل میرے ساز سے سب نے
رس لیا مرے کیفِ دل نواز سے سب نے

وادیوں میں جا کر کی، جب کبھی حدی خوانی
سنگلاخ راہوں کو میں نے کر دیا پانی

میں نے جب سمندر پر نغمہ اپنا پھیلایا
مطمئن ہوا طوفاں، موج نے سکوں پایا

میں نے چھو لئے پردے خلوتِ حقیقت کے
منکشف کئے اکثر راز بزمِ فطرت کے

حسن و عشق کو میں نے زندگی عطا کر دی
شورشوں کو دنیا کی خامشی عطا کر دی

مادّی فضاؤں سے دل مرا جو گھبرایا
ختم کر کے کام اپنا، پھر یہاں چلا آیا

آج بھی مرے نغمے سوزو سازِ عالم ہیں
آج بھی مرے نالے دل گدازِ عالم ہیں

اب بھی میری رنگینی ہے چمن کے پھولوں میں
اب بھی ہے جنوں میرا دشت کے بگولوں میں

اب بھی گونج ہے میری کوہسار میں باقی
اب بھی ہے رجز میری کارزار میں باقی

اب بھی عشق کے دل میں میری آگ باقی ہے
اب بھی حسن کے لب پر میرا راگ باقی ہے

برگ و بار پر طاری رنگِ فکر ہے میرا
محفلِ محبت میں اب بھی ذکر ہے میرا

میرے مرنے جینے میں فرق ہے تو اتنا ہے
پہلے تھا میں دنیا میں، آج مجھ میں دنیا ہے

پُر مرے تکلم سے زندگی کی راتیں ہیں،
میرے شعرِ تر گویا میرے مُنھ کی باتیں ہیں

اپنے نورِ باطن سے شعلۂ جہندہ ہوں
میں یہاں بھی زندہ ہوں، میں وہاں بھی زندہ ہوں

نیستی و ہستی کا راز میں یہ سمجھا ہوں
خود ہی اپنی محفل تھا، خود ہی اپنا پردہ ہوں

زندگی ہے بیداری نیند ہے فنا میری
نام میرا باقی ہے، ہے یہی بقا میری

چراغِ ساحل

(اک چِتا میں آگ کے شعلے فروزاں دیکھ کر)

ساحلِ بحر، درخشاں نظر آتا ہے مجھے
چند انگاروں میں طوفاں نظر آتا ہے مجھے

اک جہنم تپش افشاں ہے سرِ مرکزِ آب
ایک آتش کدہ لرزاں نظر آتا ہے مجھے

شامِ ساحل ہے کہ اک ماتمِ رنگینِ حیات
موجِ ہستی میں چراغاں نظر آتا ہے مجھے

سُرخ لہروں میں ہوا کی ہے تموّج پیدا
ایک ہنگامۂ سوزاں نظر آتا ہے مجھے

نیند طاری ہے تخیّل پہ شدید اور مہیب
موت کا خوابِ پریشاں نظر آتا ہے مجھے

جس کو فطرت نے کیا سوزِ حقیقت تفویض
اُس کا انجام فروزاں نظر آتا ہے مجھے

موت کی گود میں فرزندِ وطن ہے کوئی،
آگ کی سیج پہ انساں نظر آتا ہے مجھے

کیوں نہ ہو جائے پراگندہ دماغِ ساحل
خونِ تازہ سے ہے لبریز چراغِ ساحل

اسے دریا کے تلاطم نے بُجھایا نہ کبھی ، اسے ساحل کی ہواؤں نے ستایا نہ کبھی

بُجھ کے پھر شمع جلی ڈوب کے تارے نکلے اس کی فطرت میں تغیّر مگر آیا نہ کبھی

دل پسیجا نہ کسی کا بھی دھوئیں سے اسکے دامنِ موج نے سینے سے لگایا نہ کبھی

ابر نے بھی کبھی بوچھار سے ٹھنڈا نہ کیا آندھیوں نے اسے جلنے سے بچایا نہ کبھی

درد پیدا نہ ہوا اسکا کسی کے دل میں اس کے شعلوں کو محبت نے دبایا نہ کبھی

صبح کو اس پہ نوازش نہ ہوئی شبنم کی رات کو خاک سے تاروں نے اُٹھایا نہ کبھی

اپنی موجوں میں کیا بادِ فنا نے تحلیل گرمیٔ بزمِ جہاں اس کو بنایا نہ کبھی

راکھ باقی ہے نہ شعلوں کی روش باقی ہو
دلِ شاعر میں مگر اس کی تپش باقی ہو

شامِ لحد

اپنی حد پر بھی نہیں ملتا نشانِ زندگی — گر پڑا تھک کر کہاں لے کاروانِ زندگی؟
بے گل و بے شمع بھی انسان جی سکتا ہی کیا — غالباً ہو کا مکاں ہے خاکدانِ زندگی
چلتے چلتے راستے میں ہو گئی ہو جس کو شام — وہ مسافر ہے اسیرِ امتحانِ زندگی

ناگہاں اس کا الٹ جانا بہت آسان ہے
موت کی چند انگلیوں پر زیست کا میدان ہے

مستقل اک نیند ہے مقسومِ دنیائے نیاز — مائلِ رم، غزنوی سے اب نہیں زلفِ ایاز
عمر بھر کرتا رہا تحقیقِ اسرارِ حیات — قبر میں آ کر کھلا یہی تو تھا ہستی کا راز
شام ہے روشن کر دے شمعِ حرم سے گھر مرا — حسبِ عادت روشنی میں مجھ کو پڑھنی ہے نماز

میری آنکھوں کو تمنائے تماشا ہے ہنوز
لاؤ تارے میری راتوں کا اندھیرا ہے ہنوز

خامشی، وہ بھی بھیانک، تیرگی، وہ بھی اداس — یہ مآلِ زندگی یارب مجھے آئے نہ راس
صبح کی تخلیق کر میری شبِ تاریک میں — یوں سرابِ نور کا کب تک کفن میں انعکاس

ایک سناٹا، بلا انگیز تا حدِ نظر
دُور تک گھیرے ہوئے ہنگامۂ خوف و ہراس

گردشِ ایّام کیوں مجھ تک گذر کرتی نہیں
زندگی کیوں رُخ کبھی اپنا اِدھر کرتی نہیں

استخوان و گوشت کا اک مزبلہ، خوار و ذلیل!
اُس پہ تاریکی مسلّط، یا جلیسُ، یا جمیل!

اب کہاں وہ شورشِ نظارۂ حسن و جمال
اب کہاں وہ پائے آوارہ میں شورِ الرّحیل

بھول جائے زندگی ہستی کو میری بھول جا
گو نہ ہونا ہی مرا ہے میرے ہونے کی دلیل

صبح کی اُمید آسودہ کُنِ جذبات ہے
عالمِ فرصت نشینی کی یہ پہلی رات ہے

دل مرا وحشی نہیں احساس دیوانہ نہیں
غیر معمولی یہ ایسا کوئی افسانہ نہیں

زندگی میں لاکھ بار اس پر اُٹھایا ہے قلم
راز سے اس کے مری تخیل بیگانہ نہیں

صبحِ ہستی کے لئے تھی ناگزیر اک شام بھی
شاہکارِ نظمِ فطرت ہے، یہ ویرانہ نہیں

پھر فروغِ نیستی سے ہستیاں بن جائینگی
تربتیں کروٹ بدل کر بستیاں بن جائینگی

دعائے نیم شبی

وبالِ زیست ہے دردِ نہاں کی بے سببی
رہینِ دستِ دُعا ہے مری سکوں طلبی

شرابِ حسن و لبِ دوست اے جزاک اللہ!
عجیب چیز ہے میرا مذاقِ تشنہ لبی

بجھے جو آگ نہ دل کی تو کیا علاج اس کا
نگاہِ مست سے پی کر فسردہ عَلَنی

کسی سے فطرتِ غمِ دوست، کیف گیر نہیں
ترانۂ عجمی ہو کہ نغمۂ عربی

تپیدہ دل، تپش اندوز، بیقرار ہوں میں
مزاجِ برق ہوں، سیماب ہوں، شرار ہوں میں

الٰہی سوزِ دروں کو شگفتہ کاری دے
غمِ نہفتہ سے فطرت کو رستگاری دے

یہ اضطراب مٹا دے مری طبیعت کا
حیاتِ عشق کو پیغامِ خوشگواری دے

ضیائے شمع ہو تسکینِ روحِ پروانہ
وفائے حسن و محبت کو اُستواری دے

جو بیقرار ہی رکھنا ہے پچھلی راتوں میں
تو حسن کو بھی مرے ساتھ بے قراری دے

دلِ قرار طلب کامیاب ہو جائے
دُعائے نیم شبی مستجاب ہو جائے

ارضِ تاج

(شاعرانہ نقطۂ نگاہ سے)

ارضِ تاج

اے مسافر، آمری ویراں سرا کی سیر کر
پردہ ہائے خاک پر ماہ و سُہا کی سیر کر

ریت کے ٹیلے پہ آکر بے تکلف بیٹھ جا
اور اک اُجڑی ہوئی بزمِ وفا کی سیر کر

شوخیٔ عنوانِ افسانہ ہے مستورِ حجاب
ابتدا پر غور فرما انتہا کی سیر کر

ڈھونڈ گردِ راہ میں میرے وطن کی عظمتیں
سوزِ خاکستر میں انوار و ضیا کی سیر کر

میرؔ و غالبؔ کے ہیولے جس کی مٹی سے بنے
اُس زمیں، اُس خاکدانِ ارتقا کی سیر کر

دیکھ جمنا لے رہی ہے کسل سے انگڑائیاں
اِس کی موجوں میں سرابِ غم فزا کی سیر کر

بھیج پروانوں کی خاکستر پہ رحمت اور سلام
محفلِ رفتہ کے آثارِ فنا کی سیر کر

سینۂ گُل چاک ہے، غنچے کے دل میں تیر ہے
کیا بھیانک ایک رنگیں خواب کی تعبیر ہے

زیرِ دامانِ اُفق دُھندلے سے کچھ انوار دیکھ
زندگی کی وسعتوں میں موت کے آثار دیکھ

دیکھ، میرے شبنمستاں کا مآلِ تازگی
خشک ہو کر پھول بنجاتے ہیں کیونکر خار دیکھ

دیکھ دل کی آنکھ سے قصرِ شہی کی نیستیں
یہ شکستہ بام، وہ ٹوٹی ہوئی دیوار دیکھ

دیکھ وہ ہے سامنے اک گنبدِ مینو سواد
وہ نظر آتا ہے ویرانے میں اک مینار دیکھ

دیکھ، مغرب کی طرف سورج کی زرّیں خوابگاہ
جانبِ مشرق مجسّم اک سحر بیدار دیکھ

دیکھ امواجِ ہوا میں تیرتے ہیں پَراں ہنوز
ہے فضائے خونچکاں پُر رقص میں تلوار دیکھ

دیکھ، قلعے کی فصیلِ سُرخ و زنگِ انقلاب
اور محلوں کے محل پر خاک کے انبار دیکھ

منظرِ تاراجیِ باغ و بہارِ ماست ایں
عبرتِ نظّارہ، تصویرِ دیارِ ماست ایں

اے مسافر سخت نکلا ہفت خوانِ زندگی
رُک گیا منزل سے پہلے کاروانِ زندگی

موت ظلمت بن کے چھائی ہے جس ارضِ پاک پر
ذرّہ ذرّہ اس کا دیتا ہے نشانِ زندگی

واشگفتِ گل، خزاں کی ایک رودادِ حزیں
خامشی ہر خار کی اک داستانِ زندگی

ہم جنھیں سمجھے ہوئے تھے زندگی گلستاں
خود انھیں پھولوں نے لوٹا گلستانِ زندگی

پائے جاتے ہیں ستارے اب تک اسکی خاک میں
یہ زمیں بھی ایک دن تھی آسمانِ زندگی

کل جس ایواں میں چھلکتے تھے مئے عشرت کے جام
آج ہر پتھر ہے اُس کا نوحہ خوانِ زندگی

دیکھتا ہے تو جسے ویران، کل تھا یہ دیار
عظمتوں کی ایک دُنیا، اک جہانِ زندگی

ذرّہ ذرّہ جو غمِ ایام سے تفتیدہ ہے

اس کی ہر کروٹ میں اک خورشیدِ نو پوشیدہ ہے

آ مسافر، کچھ مناظر بھی دکھاؤں میں تجھے
گوشے گوشے میں وطن کے لیکے جاؤں میں تجھے

اخذ کی جاتی ہے ظاہر سے حقیقت کس طرح
سیر کرنا بزمِ عبرت کی سکھاؤں میں تجھے

تیری آنکھوں میں تماشائے غم و حسرت کروں
آئینہ احساس کا اپنے بناؤں میں تجھے

خشک ہونٹوں سے ہنگامہ ہوسے، زبانِ تشنہ سو
نوحہ بربادیٔ محفل سناؤں میں تجھے

سینۂ ہر ذرہ سے نشتر کدہ پیدا کروں
خود بھی رووں اور رو رو کر رلاؤں میں تجھے

دل ہے یا پتھر ترے سینے میں، اندازہ کروں
اک فغانِ زیرِ لب سے آزماؤں میں تجھے

جب تو مضطر ہو، تو دوں سرمایۂ تسکینِ نو
زخم خوردہ اپنے سینے سے لگاؤں میں تجھے

میں کہ اک باقی حدیثِ گلشنِ تاراج ہوں
ترجمانِ وارداتِ بزمِ دوشیں آج ہوں

تاج محل

آ تجھے میں اپنے فردوسِ وطن میں لے چلوں
جس میں حوریں باغباں ہیں اس چمن میں لے چلوں

اک مکمل آئینہ خانہ دکھاؤں میں تجھے
اک مجسّم رنگ و بو کی انجمن میں لے چلوں

باغچہ یہ وہ نہیں جو ملک تھا شداد کی
جو ہے جنت قدسیوں کی اس عدن میں لے چلوں

جلوہ گاہِ لالۂ و گُل کی کراؤں تجھ کو سیر | صبح زارِ نسترین و نسترن میں لے چلوں
آ دکھاؤں وہ مرقع جس پہ تو مر کر کہے، | اس کی اک تصویرِ پوشیدہ کفن میں لے چلوں
زندگی کی جسکے گوشوں سے اُبلتی ہو شراب | جو ابھی باقی ہے اُس بزمِ کہن میں لے چلوں
دعوتِ صد کیف دوں میں روحِ تشنہ کو تری | نور کے تڑکے ستاروں کی پھبن میں لے چلوں

لے یہ نقشِ سادۂ خاکسترِ برباد دیکھ
آنکھ بن کر دُرّۃُ التاجِ خرابِ آباد دیکھ

پُرسکوں حُسن و محبت کا یہ اک طوفان دیکھ | جسکے حُسن و عشق دو عنواں ہیں وہ رومان دیکھ
یہ مصوّر کا تخیُّل اور خوابِ مرمریں | روح میں ہوتا ہے جسکو دیکھ کر ہیجان دیکھ
دیکھ اسکے فرش پر ہیں عرش کتنے جلوہ گر | دیکھ اک افسانۂ ممتاز کا عنوان دیکھ
سبزہ در سبزہ، گُل اندر گُل، بہار اندر بہار | کر نظر ماحول پر اسکے پھر اس کی شان دیکھ
دیکھ وقتِ صبح اس میں جلوۂ ماہِ تمام | شام کو اس کی تجلّی کے نئے سامان دیکھ
تکملہ صنعت کا ہے اسکا ہر اک نقش و نگار | آ گیا ہے کھچ کے اک نقطے میں ہندستان دیکھ
اسکی بالیں پر نظر آتا ہے قلعہ جلوہ بار | اور جمنا کر رہی ہے پائینتی اشنان دیکھ

کیا متاعِ دو جہاں سے یہ گراں قیمت نہیں
پوچھتا ہوں میں کہ یہ کیا ہے اگر جنّت نہیں؟

یہ بظاہر ایک گورستانِ خوش انداز ہے — مرقدِ شاہ جہان و مدفنِ ممتاز ہے
اس سے عبرت کی جگہ لیکن ہے عشرت آشکار — دل یہاں آ کر بہل جاتا ہے یہ کیا راز ہے؟
"قلبِ شاعر" پر حقیقت ہو چکی ہے منکشف — "ذہنِ شاعر" خلوتِ اسرار کا غمّاز ہے
فی الحقیقت "تاج" ہے آرام گاہِ حُسن و عشق — مشرقِ شوق و نیاز و جلوہ گاہِ ناز ہے
ہے محبّت اک شگفتہ اس کی تعمیری اساس — زندگی یوں نقشِ عبرت پر اثر انداز ہے
بھول جاتا ہے یہاں انسان اپنے رنج و غم — روح کے نغمے ہیں جس میں جذبۂ وہ ساز ہے
خوبصورت اک اضافہ بزمِ فطرت میں ہے "تاج" — جو حقیقت کی فضا میں مائلِ پرواز ہے

ہے جو گھر صاحبقراں کے جلوۂ مستور کا
عکس ہے شاید یہ اُس جنت کے قصرِ نور کا

ہمّتِ مُسلم اگر ایسے بنا لے چند گھر — موت کے در بند ہو جائیں حریمِ ہند پر
آہ لیکن دل میں جب نورِ محبت ہی نہ ہو — ظلمتِ ہستی میں کیا پیدا ہوں آثارِ سحر
کاش دُنیا اور اک شاہِ جہاں پیدا کرے — کاش پھر ہو خاک سے جسمِ محبت جلوہ گر
دیدۂ سیّاح میں گر ہو بصیرت کی چمک — اب بھی سورج دیکھ لے، ذرّوں کے سینے چیر کر
یہ بہارِ ظاہری یہ اک نشاطِ آشکار — جو بہر عنوان ہے حیرت فزائے ہر نظر
اس کا باطن ہے کچھ اس سے بھی زیادہ روح کش — کس نے دیکھے ہیں ابھی وہ جلوہ ہائے مستتر

جب محبت غور سے اس پر کرے گی تبصرہ
روح کے پردے نظر آئیں گے یہ بام اور در

عشق اس محفل میں ہے صد نالہ صد کاوش ہنوز
حسن ہے ان چلمنوں میں محوِ آرائش ہنوز

قلعۂ معلّیٰ

دیکھ یہ ایوانِ شاہی، یہ حریمِ سروری
کل یہاں چھائی ہوئی تھی سطوتِ اسکندری

اس پہ صدیوں پرچمِ اسلام لہراتا رہا
جن کی موجیں چھو لیا کرتی تھیں چترِ چنبری

دیکھ یہ شاہی محل، نظارہ خیز و کیف ریز
جن کے در پر آسماں تھا، پردۂ نیلوفری

دیکھ یہ مسجد، جیسے ڈھالا تھا موتی کوٹ کر
یہ مجسّم چاندنی، یہ مطلقاً جلوہ گری

دیکھ یہ مندر، مساوات و رواداری کے نقش
اور یہ دربارِ عام و خاص کی گردوں سری

سوختہ ساماں ہے اب یہ خرمنِ جاہ و جلال
لٹ گئی وہ محفلِ دوشینِ عہدِ اکبری

ایک افسانہ ہی خوں آغشتۂ صد انقلاب
شوکتِ شاہجہان و اقتدارِ بابری

سرخ تعمیر اس کی، لالے کا فسردہ باغ ہے
دامنِ ہستی پہ سوکھا سا لہو کا داغ ہے

اے مسافر، آ دعا مانگیں کہ اوجِ کامیاب
اس کے ہر گوشے سے پیدا ہو، برنگِ آفتاب

اکبر و شاہ جہاں کو قلعہ پھر آواز دے
جو یہاں سے صرف تھوڑی دور ہیں مصروفِ خواب

محشرِ رنگ و نوا سے پھر ہو زندہ خامشی،
سازِ کہنہ سے ہو پیدا نغمۂ چنگ و رباب

پھر ہو آثارِ شکستہ سے نمودِ یک جہاں
جلوہ گر ہو پھر جوانی بے حجاب و بے نقاب

پھر بنے خاکسترِ محفل سے اک دنیائے نَو
جاہ و صولت ہم نفس، اقبال و دولت ہم رکاب

آہ، یہ دولت سرا، یہ بارگاہِ رنگ و بو
اس خراب آباد میں اس طرح ہو جائیں خراب

ہوں حریمِ شاہ میں مسند نشیں بربادیاں
انقلاب اے انقلاب اے انقلاب اے انقلاب!

بھیج یارب زینتیں ان شہ نشینوں کے لئے
یہ مکاں ترسا کریں کب تک مکینوں کے لئے

مسجدِ جامع

دیکھ یہ اسلافِ مسلم کا عبادت خانہ ہے
فرقِ شاہی جس میں جھکتا تھا، یہ وہ کاشانہ ہے

رفعتِ اسلام تھی رفعت سے اسکی آشکار
آہ، وہ رفعت جو اک بھولا ہوا افسانہ ہے

دیکھ ہر پتھر میں ہے اک جلوۂ سنگِ حرم
اور انگڑائی ہر اک محراب کی مستانہ ہے

خامشی میں خطبۂ شاہنشہی کی گونج سُن
گو فضا اُس دور کی آواز سے بیگانہ ہے

وسعتوں میں اس کی کل سجدوں کی گنجائش نہ تھی
آج اک گوشے پہ قانع ہمتِ مردانہ ہے

وقتِ مغرب سینکڑوں فانوس جلتے تھے جہاں
اب وہاں اک شمع تسکینِ دلِ پروانہ ہے
آہ یہ مینار و گنبد کی نمود اِس دور میں
گردشِ ایام کی تسبیح کا اک دانہ ہے
ملّتِ مرحوم کی تصویرِ روحانی ہے یہ
عظمتِ اسلام کا اک نقشِ لافانی ہے یہ

اعتماد الدولہ

الغیاث، اے انقلابِ دورِ گردوں، الاماں
یہ تری ناقابلِ برداشت چیرہ دستیاں
کردئیے برباد گلہائے شگفتہ کس قدر
کس قدر مرجھائیں کلیاں نو بہار و نوجواں
اے مسافر، ہے ابھی تیری نظر مصروفِ سیر
اور میرا طائرِ دل آشیاں در آشیاں
بڑھ ذرا آگے، ٹھہر، لے آگیا وہ بھی مقام
دفن ہے ایران کا سرمایۂ عظمت جہاں
وہ بھی اک تجھ سا مسافر اک غریبِ بے وطن
کاروانِ بے کسی کا اک امیرِ کارواں
آکے لی اس سرزمیں میں اُسکی قسمت نے پناہ
مرحمت کی اُس کو فطرت نے حیاتِ جاوداں
وہ امانت دار تھا اُس گوہرِ شہوار کا
جس کے مستقبل میں ماضی کی تلافی تھی نہاں
خانہ بربادی و ویرانی کا مقصد ایک تھا
ابتدا گو تھی بُری، انجام لیکن نیک تھا

دیکھ اس تعمیرِ روشن کی درخشانی بھی دیکھ
اس تجلّی گاہ کے آثارِ کیوانی بھی دیکھ

اب بھی مطلق شاعری ہیں اسکے لافانی نقوش
ان میں رنگینیٔ صنّاعی کی ارزانی بھی دیکھ

طرزِ تعمیر آج تک اسکی ہے فردوسِ نگاہ
پارہ ہائے سنگ کی ارژنگ سامانی بھی دیکھ

اک فرشتہ ہی کھڑا اوڑھے ہوئے رنگیں ردا
خامشی بھی دیکھ اس کی اور حیرانی بھی دیکھ

سر خوشی ہوتی ہے دل کو اسکی عظمت دیکھ کر
مادّی ترکیب کا یہ کیفِ روحانی بھی دیکھ

تو نے تصویریں بہت برباد دیکھی ہیں، مگر
ایک نقشِ یادگارِ محفلِ فانی بھی دیکھ

تو نے اس ماحول میں چڑیوں کے نغمے سن لئے
اب ذرا میرے تخیّل کی پرافشانی بھی دیکھ

میری نظروں میں وہی طوفان لرزاں ہے ہنوز
سندھ کے جنگل میں نظّارہ پریشاں ہے ہنوز

وہ اندھیری رات وہ طوفان ابر و باد کا
وہ مجسّم درد بن جانا دلِ ناشاد کا

جب سمٹ کر بن گئی تھی خوف ساری کائنات
تھا ہر اک لمحہ قیامت عالمِ ایجاد کا

وہ کھلا میدان وہ آندھی وہ بے سامانیاں
ضبط کا موقع نہ موقع نالۂ و فریاد کا

کلکِ قدرت صرف تھی تقدیر کی تجدید میں
اور ہی کچھ تھا ارادہ فطرتِ آزاد کا

رات کے پردے سے نکلا نیّرِ تابانِ صبح
شور اُٹھا بزمِ امکاں میں مبارکباد کا

کاروانِ خستہ پا، آسودۂ منزل ہوا
بزمِ فطرت میں عروجِ انجام ہے اُفتاد کا

عیشِ منزل، کیفِ منزل، نورِ منزل کچھ نہ پوچھ — ہو گیا فخرِ جہاں گیری صلہ بیداد کا

جن کا ہمسر صفحۂ تاریخ پر نایاب ہے
یہ اُنھیں نام آوروں کی ایک بزمِ خواب ہے

شام کو جس وقت رخصت ہو رہا ہو آفتاب — اور ہو ہر موج میں دریا کی پیدا انقلاب
دست بر دل بیٹھ جا اس خوابگہ کے سامنے — غور سے پھر دیکھ اس کی ہر ادائے کامیاب
یہ در و دیوار پر رنگین تاروں کا ہجوم — یہ جمالِ مرمریں جیسے فرشتوں کا شباب
زیرِ ساحل تھرتھراتا ہے چراغانِ بہار — عکس اس کا جب کبھی کرتا ہے عزمِ پاتراب
انعکاسِ سنگ میں، امواج پر مینا گری — امتزاجِ رنگ میں، آمیزشِ برق و سحاب
اس کے جلووں سے ملا کرتا ہے موجوں کو قرار — دیکھ کر اس کو ٹھہر جاتے ہیں دریا میں حباب
یوں ہے اک نقشِ مجسّم نور ریز و کیف خیز — جیسے اک دُلہن ہو چندے آفتاب چندے ماہتاب

گو سراپا خامشی ہے گو سراپا سوز ہے
پھر بھی یہ اس محفلِ مرحوم کا نوروز ہے

عطر سا برسا ہوا ہے اس کی لوحِ نور پر — گلکدہ جیسے بنایا ہو کسی نے طور پر
اک ستارہ سا ہے لرزاں طشتِ نگارنگ میں — شمع سی رکھی ہوئی ہو دستِ نازِ حور پر
ہو گیا ہے مرتسم اوراقِ گل پر رنگِ صبح — موجِ مے گویا ہے رقصاں ساغرِ بلّور پر

یوں بلندی پر چمکتے ہیں نقوشِ منحنی
جیسے پروانہ تڑپتا ہو چراغِ دُور پر

عبرت انگیز و نظر افروز، شفاف و جمیل
نور کے پردے پڑے ہیں جلوۂ مستور پر

سنگِ ابیض پر بنے ہیں اس ادا سے سُرخ پھول
لعل گویا جڑ دیے ہیں تختۂ کافور پر

اس کے رنگ و آب میں ممزوج ہیں تابانیاں
چاندنی چھٹکی ہے یا افسردۂ انگور پر

فطرتاً ترجیح ہے تخئیلِ مانی پر اسے
ناز ہے اپنی حیاتِ جاودانی پر اسے

چینی کا روضہ

ذہنِ صنعت کی ذرا یہ دیکھ صنعت کاریاں
ہو رہی ہیں خاک کے انبار پر دُر باریاں

اس کا رنگِ ابتدائی کیا سمجھ سکتا ہے تو؟
اور پڑھ سکتا ہے کیا یہ ہلکی ہلکی دھاریاں؟

جانتا ہے تو برس جاتی تھیں کتنی نزہتیں
اس پہ رنگ و نور کی چلتی تھیں جب پچکاریاں

اب یہ اینٹوں پتھروں کا ایک رنگی ڈھیر ہے
کر رہی ہیں حسرتیں بیٹھی ہوئی غم خواریاں

اس کے دامن پر فروزاں تھے ہزاروں سرخ پھول
جیسے پھیلا دی ہوں ساحل پر گلابی ساریاں

شاعرِ شیراز ہے آسودۂ خوابِ گراں
فکر کو ہوتی ہیں حاصل اس جگہ سرشاریاں

اب ہے سناٹا یہاں پر موت کا چھایا ہوا
انقلابِ دہر کی دیکھ آدمی آزاریاں

وہ تقدس ہے نہ اب وہ شوکتِ ممتاز ہے
صرف اہلِ شہر ہیں اور دعوتِ شیراز ہے

دیکھ اس شاعر کا میں تجھ کو بتاؤں اک گناہ — ہو گیا جس سے وقارِ شہرت و عظمت تباہ
ڈھیر پر مٹی کے سیروں اس نے چینی تھوپ دی — ہے مگر اک گوشۂ تاریک اس کی خوابگاہ
کاش یہ تعمیر کرتا اپنے قصرِ فکر کی — کاش یہ اک شعر کہتا بے نظیر و بے پناہ
کاش یہ اک نظم کہتا بے مثال و لازوال — کاش ہوتی عرشِ اعظم تک بلند اس کی نگاہ
آج اس کے نام سے آگاہ ہے دنیا میں کون؟ — ٹین کا بے رنگ ٹکڑا اور دیوارِ سیاہ
شاعرِ شیراز آ کر ہند میں تو مر گیا — یہ تری گمنامیاں ہیں موت پر تیری گواہ
عہدِ شاہی میں جو تو دیواں ہوا تو کیا ہوا — اک ترا دیوان ہوتا زندگی کی شمعِ راہ

تیرا فنِ اطلاق تیرے حال پر کرتا نہیں
مر گیا تو کیوں کہ شاعر تو کبھی مرتا نہیں

آرام باغ

یہ تفرج گاہ، یہ ہمسایۂ خلدِ بریں — گل بداماں، گل فشاں، گل ریز، گلشن آفریں
اس کی شادابی سے قائم تھی بہارِ کائنات — سبزہ تھا ہمراز اس کا اور دریا ہم نشیں

اب بھی اس کے پاؤں چھو لیتی ہیں موجیں بار بار
اس کی بربادی میں گو ذوقِ پذیرائی نہیں

روح کو بالیدگی ملتی تھی اس کی سیر سے
عیش مندوں کے لئے تھا یہ مقامِ بہتریں

پرورش پاتی تھی اس کے سایے میں روحِ بہار
شام تھی اس کی چنار، اور صبح اسکی یاسمیں

ہاں یہ ہے دیکھے ہوئے گلگشتِ نازو جمال
ثبت ہیں اس پر حسینوں کے خرامِ نازنیں

جس کو بوسے دیرہا تھا پرچمِ جاہ و جلال
سبزۂ پامال ہے آج اسکی وہ روشن جبیں

سرو ہے افسردہ خاطر، پابگِل شمشاد ہے
لیکن ان کو اب بھی اپنا خوابِ رنگیں یاد ہے

دیکھ وہ شہزادیاں پھرتی ہیں اٹھلاتی ہوئی
ہر روش پر انکھڑیوں سے پھول برساتی ہوئی

تازہ کلیاں توڑ کر دوڑی وہ اک کمسن کنیز
نکلی کنجِ گل سے وہ اک خادمہ گاتی ہوئی

نذر لے کر تازہ پھولوں کی چلی بادِ نسیم
وہ ہوا آئی دماغ و دل کو مہکاتی ہوئی

وہ پپیہے کی صدائیں۔ وہ نواطاؤس کی
زندگی کی آگ سے سینوں کو گرماتی ہوئی

وہ ہوا شہزادہ بزمِ رنگ و بو میں باریاب
وہ چھپی کوئی لجاتی اور شرماتی ہوئی

آج اس فردوس میں باقی کہاں وہ زندگی
آج پھرتی ہیں بہاریں ٹھوکریں کھاتی ہوئی

سب جسے رشکِ کہا کرتے ہیں اب آرام باغ
اس نے دیکھی ہیں ہماری عظمتیں جاتی ہوئی

انقلابِ رفتہ سے لالے کا دل پُر داغ ہے
ہے بہاروں کا یہ رنگیں مقبرہ یا باغ ہے

جمنا

دیکھ یہ کون آرہا ہے پردۂ اسرار سے؟ — کیا ترشح ہو رہا ہے گرمیٔ رفتار سے؟
آہ، یہ بنتِ ہمالہ، مادرِ ہندوستاں — دودھ پیتی ہے زمیں جس کی مقدس دھار سے
ج بے کیفی سی ہے اس کے خرامِ ناز میں — یہ کبھی کیف آشنا تھی جذبۂ سرشار سے
سعتیں محدود اس کی دورِ ماضی میں نہ تھیں — رات دن یہ کھیلتی تھی قلعے کی دیوار سے
جلوۂ اقبال کا آئینہ تھا اس کا جمال — تھی نمودِ خلد ہر اندازِ کوثر بار سے
جگمگا اٹھتے تھے زندہ دیویوں سے اسکے گھاٹ — حسن اس پر کوندتا تھا صبح کے انوار سے
س کے سینے پر زمیں کیطرح اب چلتے ہیں ہل — اب شرر اڑتے ہیں اس کی سطحِ ناہموار سے

جستجوئے منزلِ گم گشتہ میں بیتاب ہیں
اب یہ موجیں گریۂ عبرت کا اک سیلاب ہیں

سکندرہ

ر جھکا اے زندہ دل سیّاح نیچی کر نگاہ — سامنے ہی بارگاہِ خسروِ کیواں پناہ
جسّم نور، یکسر صبح، مطلق آئینہ، — جس کے پرتو سے نکل جاتے ہیں بچ کر مہر و ماہ

دن ڈھلے، راتیں ڈھلیں آئے ہزاروں انقلاب
اپنے مرکز پر یوں ہی قائم ہے یہ تصویرِ جاہ

دیکھ اس تعمیر پر اب تک برستا ہے جلال
کانپتی ہے جب نظر پڑتی ہی سوئے خوابگاہ

کچھ نقوش اس طرح کندہ ہیں در و دیوار پر
جیسے ہیں محفوظ اب تک افسر و تاج و کلاہ

ہے یہ خلوت اُس کی جس کے پنجۂ تدبیر نے
ایک رستہ کر دیا از بت کدہ تا خانقاہ

یہ امینِ سطوتِ مرحومِ ارضِ ہند ہے
کر نہیں سکتی اسے گردش زمانے کی تباہ

جب ادھر آئے گی خود داری کا سر جھک جائیگا
جب ادھر نکلے گا استبداد ٹھوکر کھائیگا

عالمِ ایجاد کوئی آئینا پیدا کرے
اُس میں اس تصویرِ عظمت سی جلا پیدا کرے

پھر اُسے رکھے زمانے کی نظر کے سامنے
قلب میں جلوہ عزمِ اسلاف کا پیدا کرے

خفتگانِ خاک کو پھر دے نویدِ زندگی
انحطاط اے کاش رنگِ ارتقا پیدا کرے

مقبرے بنجائیں اس دُنیا کے ایوانِ حیات
انقلابِ نو کوئی ایسا خدا پیدا کرے

ہو خطیبِ زندگی پھر خطبہ خواں مینار پر
خامشی میں سازِ فطرت پھر نوا پیدا کرے

بام و در سے پھوٹ نکلے چشمۂ آبِ حیات
یہ ضیائے مرمریں نورِ بقا پیدا کرے

موت کی ہیبت سے جس نے کر دیا تھا بے نیاز
کیا عجب وہ روح پھر بزمِ فنا پیدا کرے

عظمتوں کی اک امانت خاک کے سینے میں ہے
اک جہانِ سطوتِ رفتہ اس آئینے میں ہے

فتح پور سیکری

دیکھ، ادب سے دیکھ، یہ نقشِ عقیدت کا اُبھار
"موت کی وادی" نے پائی تھی حیاتِ مستعار

سُن گرج توپوں کی اور جھنکار تلواروں کی سُن
دیکھ وہ برپا ہے زیرِ کوہ شورِ کارزار

اس زمیں پر بھی کبھی برسا ہے، انسانی لہو
خونِ مسلم سے بنا ہے یہ خرابہ لالہ زار

عبرتِ تاریخ کچھ بکھرے ہوئے آثار ہیں
ہیں امانت عہدِ رفتہ کی شکستہ کچھ مزار

دیکھ یہ شاہی مکانوں کا ہے اک انبارِ سُرخ
رہ گیا ہو جس طرح گھٹ کر کہیں رنگیں غبار

تھا تصرّف یہ بھی اک گوشہ نشیں درویش کا
پھوٹ نکلی سینۂ کہسار سے موجِ بہار

یہ مکاں یہ قصر ہیں یہ حمّام ہیں یہ مینار و در
اب بھی ہیں شان و شکوہِ اکبری کی یادگار

خامشی ہیں زندگی کی بُو کہیں باقی نہیں
ہیں مکاں باقی مگر ان کے مکیں باقی نہیں

غسل کو بھرتے تھے جن حوضوں میں کل عطرِ گلاب
بھیڑیوں اور گیدڑوں کے آج ہیں وہ فرشِ خواب

جنمیں ہوتی تھیں فروکش، رانیاں، شہزادیاں
وہ محل چمگادڑوں کی گردشوں سے ہیں خراب

جنمیں کل تک تھے ابوالفضل اور فیضی جلوہ بار
آج اُن میں ہر طرف ویرانیاں ہیں باریاب

زندگی تھی ذرّے ذرّے میں یہاں آئینہ دار
دیکھنے والے ابھی باقی ہیں ماہ و آفتاب

اب یہ محفل اک شکستہ ساغرِ بے بادہ ہے
جیسے لٹ کر رہ گئی ہو کائناتِ رنگ و آب

جانے والے کیوں نہ اپنے ساتھ ان کو لے گئے
آہ یہ آثارِ عظمت یوں اسیرِ انقلاب!

"پردہ داری می کند بر طاقِ کسریٰ عنکبوت"
"چغد نوبت می زند بر گنبدِ افراسیاب"

محو کن ذوقِ نظر را در تماشائے دگر
تا بر آید از ہمیں ویرانہ دنیائے دگر

مولدِ غالب

اے مسافر تو نے دیکھے، قصر و ایوان و مزار
جھونپڑا بھی دیکھ اک شاعر کا ہو کر اشکبار

آگرے کی خاک سے سورج ہوا تھا اک طلوع
ضو فگن، ضو ریز، جلوہ آفرین و جلوہ بار

جانبِ دہلی فضائے آگرہ سے کھینچ کر
لے گیا ساتھ اس کو دار السلطنت کا اقتدار

ہر طرف ہے گونج اُس کے نغمۂ الہام کی
سرزمینِ ہند ہے اُس کی نوا سے نغمہ زار

ہے یہ مولد اُس کا، جو ہے زندۂ جاوید آج
اس کی ویرانی میں ہے تخئیلِ شاعر کا نکھار

زندگی میں اپنی اس انجام سے واقف تھا وہ
اُس کا یہ اک شعر مستقبل کا تھا آئینہ دار

اُگ رہا ہے سبزہ اے غالبؔ در و دیوار سے
"ہم بیاباں میں ہیں اور گھر میں بہار آئی ہے"

قطرے نے نشو و نما دی قلزمِ مواج کو
ناز شیں ہے مولدِ غالبؔ ارضِ تاج کو

شامِ حال

اے مُسافر تھک گیا؟ اب فرصتِ آرام ہے
حال و ماضی پر نگرِ تنقید کا ہنگام ہے

ذرّے ذرّے کی زباں ہو وقفِ شرحِ رفت و بود
دیکھ کیسی ابتدا تھی اور کیا انجام ہے

گر زمیں سے چھین لے فطرت یہ آثارِ قدیم
اکبر آباد آج اک بازیچۂ ایّام ہے

چلتی پھرتی چند لاشیں ہیں یہ اربابِ وطن
موت بن کر ان پہ طاری زندگی کی شام ہے

وہ زمیں جو مرکزِ انوارِ علم و فضل تھی
اب جمود و جہل اُس کا اک مذاقِ عام ہے

وہ زمیں پیدا کئے جس نے سلاطین و ادیب
آج اپنی پستیوں سے ہر طرف بدنام ہے

یہ ہجومِ خلق، یہ غفلت و شوں کا اجتماع
روح سے محروم اک ہنگامۂ اجسام ہے

جیسے پروانے خرابِ صبح بعدِ شمع ہوں
کچھ مجاور نرم بتوں کے گرد جیسے جمع ہوں

صبحِ مستقبل

آئے گا لیکن اک ایسا بھی زمانہ آئے گا
تیرگی کے بعد محفل پر اُجالا چھائے گا

جب ہُوا اہلِ وطن کے دل کو احساسِ وطن
یہ جمود و جہل دم بھر میں فنا ہو جائے گا

گردشِ عالم کبھی رہتی نہیں اک حال پر — جس نے پھیری ہے نظر وہ رحم بھی فرمائے گا

تاج کے مینار سے ہوگا نیا سورج طلوع — مدفنِ اکبر سے ماہِ نو کرن چمکائے گا

قلعے سے پھر سطوتِ اسلاف ہوگی جلوہ گر — رامِ باغِ آرام کی جنت سجا کر لائے گا

مسجدِ جامع سے اک تکبیر ہوگی پھر بلند — ساحلِ جمنا سے اک بادل نیا لہرائے گا

مولدِ غالب کی یہ ویرانیاں مٹ جائیں گی — نغمۂ سیماب اُس پر زندگی برسائے گا

اے مُسافر یاد رکھنا یہ مرا پیغام ہے
یہ مرا پیغام تیری سیر کا انجام ہے

مزارِ اکبر

ہے یہ کس شاہنشہِ ذی مرتبت کی خوابگاہ؟ — لے رہا ہے جس میں انگڑائی جلالِ بے پناہ
رّے ذرّے میں ہے جس کے ارتعاشِ مہر و ماہ — باریابی کے تخیّل سے لرزتی ہے نگاہ

سطوت و عظمت کی عبرت خیز اک تصویر ہے
حالِ صد جلوہٴ ماضی یہ اک تعمیر ہے

ں کی خلوت میں ہے خوابیدہ وہ بزم آرائے ہند — گونجتے تھے جسکی عظمت سے کبھی اقصائے ہند
جسکے فیضِ مرحمت سے تنگ تھا پہنائے ہند — ہند آج اُس فیض سے محروم ہے، اے وائے ہند

گوشے گوشے سے ہے پیدا عہدِ انور کی صدا
آرہی ہے آج تک اللہ اکبر کی صدا

سمتِ مغرب عظمتِ نظارہ ہے اس کا مزار — جانبِ مشرق ہے اُس کا قلعہ اب تک قرار
ں دکن میں سیکری کے قصر اس کی یادگار — ہے شمالاً اس کا اک دیوانِ اعظم پردہ دار

آگرے پر چار جانب سے ہے یوں چھایا ہوا
جیسے کوئی ابرِ تر ہو جھوم کر آیا ہوا

گو کیا گردش نے اس روضے کو ویراں بار بار
صنعتیں اس کی مگر اب بھی ہیں فخرِ روزگار

روز کرتی ہے طواف ایران و کابل کی بہار
ہر گُلِ نو عہدِ اکبر کا ہے اک آئینہ دار

اس کے پائیں باغ سے نزہت ٹپکتی ہے ہنوز
نام لے کر عندلیب اس کا چہکتی ہے ہنوز

سب سے پہلی آگرے میں یہ وہی تعمیر ہے
جس کی ہر تعمیر اک اتری ہوئی تصویر ہے

اس کے میناروں پہ فطرت مائلِ تکبیر ہے
اس کی دیواروں پہ اک ہنگامۂ تنویر ہے

اس کا عکسِ مرمریں بڑھ کر جو نور افشاں نہ ہو
آفتابِ صبح ایسی شان سے تاباں نہ ہو

آگرے کی سرزمیں یوں ہند میں ممتاز ہے
اکبرِ ذیجاہ کی یہ خواب گاہِ ناز ہے

مرقدِ شاہِ جہاں سے بھی یہ سرافراز ہے
اس طرح دو بادشاہوں کی امینِ راز ہے

ہیں اسی عالم میں موجود اور عالم میں نہیں
کیا تماشہ ہے، ہمیں ہیں ہیں مگر ہم میں نہیں

سطوتِ ہندوستاں، اے اکبرِ عالی وقار
مرجعِ انس و ملائک آج ہے تیرا مزار

پھول رحمت کے ہوا کرتے ہیں روز اس پر نثار
تو ہے زندہ عظمتِ باقی ہے تیری زندہ دار

جب ترے روضے کی جانب رُخ کیا کرتے ہیں ہم
اک "سلامِ عجز" تجھ کو کر لیا کرتے ہیں ہم

نورجہاں ثانی

(شہزادی سکینہ بیگم)

کجکلاہی بھی وہی ہے کج ادائی بھی وہی
ہے نگاہِ گرم کی صبر آزمائی بھی وہی

ہے وہی شیر افگنی کا طور تیور سے عیاں
بے خودی میں ہے مذاقِ خودنمائی بھی وہی

ہیں وہی عہدِ جہانگیری کی سحر آرائیاں
چہرۂ تاباں کی ماہ و مہر زائی بھی وہی

جاذبیّت ہے وہی خال و خدِ معصوم میں
اور ہے آنکھوں میں کیفِ انتہائی بھی وہی

عظمت و عزمِ شجاعت بھی وہی ہر جلوہ ریز
اور مردوں کا سا اندازِ رسائی بھی وہی

جب تری ہستی کی کرنیں جلوہ افشاں ہوگئیں
بزمِ عالم میں نئی شمعیں فروزاں ہوگئیں

نام زندہ شاہ عالم کا تری شہرت میں ہے
ذکر اب تک تیرا باقی درسِ حرّیت میں ہے

وہ ترا علمی تبحّر وہ ترا فضل و کمال
آج تک محفوظ تو ذہنیّتِ فطرت میں ہے

ہے تری تصویر تکمیلِ تصور کی نشاط
جو فنا کا نقش بن کر دیدۂ عبرت میں ہے

جس پہ اب تک ناز کرتی ہیں خواتینِ وطن،
ایک ایسی بھی امانت خاک کی خلوت میں ہے

تیری شرحِ زندگی ہے جنّتِ اہلِ نظر
تو بھی اک عنوان تاریخِ نسائیّت میں ہے

"سب کہاں کچھ لالہ و گل میں نمایاں ہوگئیں"
"خاک میں کیا صورتیں ہونگی جو پنہاں ہوگئیں"

(چودھویں شب کی نورانی فضائیں)

فضائے "تاج" تیری دلنشیں معلوم ہوتی ہے
میں سچ کہدوں مجھے جنّت یہیں معلوم ہوتی ہے

ضیا تیری ضیائے بہتریں معلوم ہوتی ہے
تری محراب حوروں کی جبیں معلوم ہوتی ہے

تری بنیاد، اور پھر بے نیازِ انقلاب ایسی
جہاں معلوم ہوتی تھی وہیں معلوم ہوتی ہے

تری تابانیوں کا کیوں نہ اس کو معجزہ کہیے
اندھیری رات بھی تو چودھویں معلوم ہوتی ہے

تری تعمیر دیتی ہے نگاہوں کو سکوں کیا کیا
تری تصویر کتنی دل نشیں معلوم ہوتی ہے

ترے نظّارے میں جذبے محبت کے لرزتے ہیں
وفاؤ حسن کی تربت یہیں معلوم ہوتی ہے

تری معصومیت، جس کو تصوّر چھو نہیں سکتا
مجسّم ایک خوابِ مرمریں معلوم ہوتی ہے

اگر ہوگی تو جنّت نقل ہوگی تیرے باغوں کی
بہارِ خلد تیری خوشہ چیں معلوم ہوتی ہے

نمایاں ہیں ہر اک ذرّے سے آثارِ درخشانی
یہ خاک اب تک ستاروں کی امیں معلوم ہوتی ہے

یہ وہ ماحول ہے جس کے محیطِ نور میں گھر کر
نگاہِ حُسن اکثر سرمگیں معلوم ہوتی ہے

کنول کے پھول ہیں یا اک طلسمِ کیف و سرمستی
ہنسی ہے اور شرابِ انگبیں معلوم ہوتی ہے

وہ عظمت، جو خفا ہو کر گئی ہے قومِ مُسلم سے
حجابِ "تاج" میں گوشہ نشیں معلوم ہوتی ہے

وہ رفعت، جس کا ماتم کر چکی ہے قسمتِ مُسلم
انہیں تسکین گاہوں میں مکیں معلوم ہوتی ہے

وہ لذّت، جذب کرتا ہی جو اس منظر سے نظّارہ
محبّت کی نگاہِ اوّلیں معلوم ہوتی ہے

ادب ملحوظ اے سیّاح، روحِ عشرتِ شاہی
گیاہ و سبزہ میں خلوت گزیں معلوم ہوتی ہے

حقیقت کی یہ وہ منزل ہی جس کے ذرّے ذرّے میں
تجلّی ایک مہمانِ حسیں معلوم ہوتی ہے

نظر کے ساتھ سر جھکتا ہے ہر ہر گام پر میرا
مرے سجدوں کے قابل یہ زمیں معلوم ہوتی ہے

یہ عالم محویت کا وقتِ سیرِ تاج ہوتا ہے
کہیں ہوتا ہوں میں دُنیا کہیں معلوم ہوتی ہے

جسے "سیماب" ارضِ تاج" کہتے ہیں فرشتے بھی
وہ میرے ہی وطن کی سرزمیں معلوم ہوتی ہے

تاج کنارِ شفق میں

افق کے لالہ زار سے گذر رہا ہے آفتاب
فضاؤں کو سلامِ شام کر رہا ہے آفتاب

طلائی تھال میں شفق سجا کے لائی شام کو
سکونِ منظر و نظر بنا کے لائی شام کو

گلوں کے قمقمے جلے، کنول جھکا ہوا اُٹھا
شفق ہوئی جو رنگ بار "تاج" جگمگا اُٹھا

یہ طائرانِ خوشنوا کبھی یہاں کبھی وہاں
سرود ریز و شور خیز و چہچہہ بیز و نغمہ خواں

قطار در قطار سرو پا بہ گل کھڑے ہوئے
ستارے کیاریوں میں رنگ رنگ کے جڑے ہوئے

قدح یہاں سبو یہاں، بہار چار سُو یہاں
سمٹ کر آ گیا ہے اک جہانِ رنگ و بو یہاں

مگر حریمِ شاہ میں ہے عزمِ سیرِ شام کا
کہ ہو رہا ہے اہتمام محشرِ خرام کا

اُدھر شفق کی شعلہ تابیاں بنفشہ زار میں
ادھر ریاضِ "تاج" رنگ و نور کی کنار میں

یہ ہلکے ہلکے سائے، یہ نکھار برگ و بار کا
کہ جیسے لمحہ اک یہی، شباب ہے بہار کا

شفق کا عکسِ شوخ پڑ رہا ہے فرقِ "تاج" پر
ہے عقل دنگ شیشہ و شرر کے امتزاج پر

ضرورتِ ضیا، نہ روشنی کی احتیاج ہے
برس رہا ہے نور سا، یہ شمع ہے کہ "تاج" ہے

عروسِ "تاج" جلوہ گر ہے نور کے لباس میں
تڑپ رہی ہے برقِ طور حور کے لباس میں

سمن بھی نسترن بھی، فیضیاب اسکے نور سے
فضائے شام کی ہے آب و تاب اسکے نور سے

بلا سے دھوپ ڈھل گئی نہ ہو جو روشنی نہیں
فروغِ "تاج" سے تجلیات کی کمی نہیں،

ہجومِ رنگ و بو میں ہے تجلّیِ دوام بھی
کرشمہ ہے "یہ تاج" کا کہ صبح بھی ہے شام بھی

جھلک نقابِ شام میں ہے لیلیٰ بہار کی
چمک نمودِ "تاج" میں ہے لعلِ شاہوار کی

چمک رہا ہے "تاج" بھی شگفتہ ہیں گلاب بھی
ہیں قائم ایک ہی جگہ "شفق" بھی "آفتاب" بھی

نظیر اکبر آبادی

فطرت سے تخیّل کو سرشار کیا تو نے
تصویرِ تصوّر کو ہموار کیا تو نے

تکمیل کو جب غفلت دنیا کی نہ پہونچی تھی
اُسوقت بھی دُنیا کو بیدار کیا تو نے

انوارِ حقیقت کو تو عرش سے چُن لایا
عالم کو شناسائے اسرار کیا تو نے

جب تھا نہ کسی دلمیں جذبہ وطنیّت کا
ترکِ وطنیّت سے انکار کیا تو نے

تھا "تاج" سے اس درجہ مانوس کہ مر کر بھی
آرام وہیں زیرِ دیوار کیا تو نے

ہے "تاج" کے سائے میں محفوظ بقا تیری
شہرت وُہی باقی ہے "تاج الشعرا" تیری

صبحِ تاج

ہب ہوئی ظلمت گہہ ہستی میں تخلیقِ سحر — چاند اور بے انتہا تاروں کی روحیں کھینچکر

تجا کی صبح نے یارب یہ کیا اندھیر ہے؟ — میرے جلووں سے ضیا اندوز ہیں بحر اور بر

اپنے نظارے سے لیکن میں ہی خود محروم ہوں — اپنی صورت خود کبھی آتی نہیں مجھ کو نظر

رہ گیا بزمِ ازل میں شاید آئینہ مرا — اس لئے اپنی حقیقت سے ہوں اب تک بیخبر

یکھتی ہے شام تصویرِ شفق میں اپنا رنگ — رات ہی آئینۂ مہتاب میں صورت نگر

آبجو میں عکس اپنا دیکھتا ہے ماہتاب — چاندنی میں پھول کو نازش ہے اپنے سائے پر

فتاب آئینہ میرا ہو، یہ ممکن ہی نہیں — ہیں سراپا رنگ و نور اور آگ اس میں مستتر

فرصتِ تکمیل بہرِ حسرتِ دیرینہ دے
جیسے جلوے ہیں مرے، ایسا ہی اک آئینہ دے

بجائے صبح پیدا آیا دلِ فطرت میں جوش — سینکڑوں آئینے پیدا کر دیئے جلوہ فروش

بح نے ہر آئینے میں اپنی طلعت کی تلاش — صورتِ تصویر تھا لیکن ہر آئینہ خموش

تھا بدستور انتظار اُس کو نئے عکاس کا
جو اُسی کی طرح ہو کوثر بہ دل جنت فروش

"تاج" اُبھرا اک ستارے کی طرح تخیل سے
ضو فشاں، نزہت چکاں، کیف آفریں، تنویر کوش

ماہتابِ شب ہو جس کی دید سے عارض بجیب
آفتابِ صبح جس کو دیکھ کر ہو چہرہ پوش

مسکرائی صبح اپنی ہو بہو تصویر سے
مست ہو کر کیف سے جھومی برنگِ بادہ نوش

آ گیا لکھنے کو "شاعر" "نظمِ صبحِ تاج" پر
نکہتِ گل نے دیا اُس کو یہ پیغامِ سروش

مدتوں سے مطلع الانوار ہے یہ آج کیا
"تاج" خود اک صبح ہے پھر ذکرِ "صبحِ تاج" کیا

دیال باغ

تمدن اور مذاہب نے جو کی ہنگامہ آرائی
کمالِ نفس نے سب سے الگ رہنے کی ٹھہرائی

خدائی ہے نتیجہ، جذبۂ ترکِ خدائی کا
ہزاروں محفلوں کا رنگ ہے اور ایک تنہائی

خزاں پر غور کر کے چند پھولوں نے کیا ثابت
ہوا کرتی ہے یوں صحرا میں رہ کر گلشن آرائی

ملا جب درسِ نو لوگوں کو صانع کی تصور کا
حقیقت نے دماغِ روح میں لی ایک انگڑائی

یہی ہے بانگِ امروز اور یہی پیغامِ فردا بھی
یہاں تنظیم ہی سے دین بھی ملتا ہے دُنیا بھی

شاہ جہانِ اعظم

اے نقش بندِ جلوۂ بے نام، اے شاہ جہاں ... اے پاسبانِ سطوتِ اسلام اے خلد آشیاں

کروٹ بدلوادی ہر اک ذرّے کو تو نے خاک کے ... اے وہ کہ اب تک یاد کرتا ہے تجھے ہندوستاں

تو نے نیازِ خلق کو نازِ سرافرازی دیا ... حاشا کہ بارِ سجدہ سنگِ آستاں پر تھا گراں

تو نے محبت کے صلے میں وہ امانت بخش دی ... روزِ ازل سے جو ترے ذہنِ رسا میں تھی نہاں

رنگ و بہارِ حسن کو کرکے فنا سے بے نیاز ... تو نے عطا فرمادیا اک افتخارِ جاوداں

گلشن میں تیری گفتگو، کلیوں کو تیری آرزو ... پھولوں کو تیری جستجو ان سب کی تو روحِ رواں

در سینۂ گل می دمد صد برقِ رنگیں نامِ تو

از ذرّہ ذرہ می چکد نو بادۂ الہامِ تو

دُنیا اگرچہ فطرتاً اک مجلسِ ظلمات ہے ... لیکن تری تعمیر سیلابِ تجلیّات ہے

چھوڑا ہے اپنے بعد تو نے اک وہ نقشِ نور بار ... جو رات کو بھی دن ہے، یعنی صبح جسکی رات ہے

صدیاں گذر جائیں مگر تیری فنا ممکن نہیں ... دُنیا میں تو باقی نہیں، یہ اعتبارِ بات ہے

اب بھی تری تصویر تاباں ہے بیاضِ تاج میں
ہے روح تیری ہر ہوا، ہر پھول تیری ذات ہے

اب بھی پیامِ زندگی دیتی ہے تیری خوابگاہ
ابتک نواسنجی تری ہنگامۂ ذرات ہے

تو ہر روشِ پر "تاج" کی ابتک ہے مصروفِ خرام
زندہ ترا اک کارنامۂ جانِ موجودات ہے

گو شد نقابِ مرگ روپوشِ تجلائے حیات
ثبت است بر ہر برگ و بارِ "تاج" طغرائے حیات

جودہ بائی کا مندر

بُت شکن بھی ہمتِ اسلام ہے بُت گر بھی ہے
قلعۂ شاہی میں مسجد ہے جہاں مندر بھی ہے

فکر کی یکسوئی ہے بہرِ اطاعت لازمی
عقل میں گنجائشِ تعیینِ بام و در بھی ہے

ماورائے قیدِ تعیّن سے بھی ہے اُسکا جمال
مظہر اُسکا آگ بھی ہے، خاک بھی پتھر بھی ہے

اے عبودیت، نظر میں وسعتیں درکار ہیں
بتکدہ کہتے ہیں جس کو وہ خدا کا گھر بھی ہے

برہمن اور شیخ ہیں پابندِ اوہام و رسوم
اک پرستش کا طریقہ اس سے بالاتر بھی ہے

ہے یہاں آغوشِ باطل سے حقیقت کی نمود
جو خلیل اللہ ہے، پروردۂ آذر بھی ہے

کیوں مساوات اب نہیں پیرایۂ اسلام میں؟
کفر برسوں پل چکا ہے سایۂ اسلام میں

روضۂ ممتاز اور مقبرۂ نور جہاں

سبزہ زار و بلبلے ———— نے چراغ و نے گلے

الا اے انقلابِ آسماں تیری ستم رانی
ہزاروں فتنہ ساماں ہیں خرابِ فتنہ سامانی

جو کل تک پھول کلیوں سے سُبک تھے باغِ عالم میں
لبِ خاموش سے ہیں آج شاکیِ گراں جانی

جنھیں کل قاقم و سنجاب میں تکلیف ہوتی تھی
اُنھیں ہی خاک میں تسکین، بعدِ خانہ ویرانی

کفن میں مُنھ چھپائے بیکس و مجبور سوتے ہیں
جنھیں تھا عالمِ موہوم میں نازِ جہاں بانی

مسلّط ہی فنا، ہر چیز پر ہر نقشِ ہستی پر
یہ نازِ حُسن بھی فانی نیازِ عشق بھی فانی

بقا خود سلب کر لیتی ہی جودت آدمیت کی
یہاں "شیر افگنی" چلتی نہیں اربابِ قوت کی

رہی نورِ جہاں، ممتاز بیگم سے خفا برسوں
اُبھرنے ہی نہ اسکی شان و شوکت کو دیا برسوں

کیا ممتاز کے ہر امتیازِ خاص پر قبضہ
جفائے تازہ برسوں کی ستم رکھا روا برسوں

مگر بعدِ فنا، فطرت بلا کی منتقم نکلی
زمانہ انقلابِ مستقل پر روئے گا برسوں

اِدھر ہی مرقدِ ممتاز پر ہر وقت گُل باری
اُدھر جاتی نہیں خوش رنگ پھولوں کی ہوا برسوں

اِدھر کویل بھی ہی بُلبل بھی، طوطی بھی پپیہا بھی
اُدھر آتی نہیں زاغ و زغن کی بھی صدا برسوں

یہاں اک محشرِ صد رنگ ہر وقت برپا ہی
وہاں اک ہُو کا عالم ہیبت افزائی تماشا ہی

اُدھر نورِ جہاں کی قبر پر حسرت برستی ہے
اِدھر ممتاز کا مرقد نگارستانِ ہستی ہے

اُدھر ہے اک شبیہِ مقبرہ افسانۂ عبرت
اِدھر اک "تاج" ابتک ارتقائے نقشِ پستی ہے

گرانی ہی گرانی ہی اُدھر بے کیف نظروں پر
جوانی ہی جوانی ہی، اِدھر مستی ہی مستی ہے

اُدھر اک مقبرہ ہے منہدم سا اور شکستہ سا
اِدھر اک مرمریں روضہ ہی اک جلووں کی بستی ہے

اُدھر کچھ گرم جھونکے لُو کے ہیں اور موسمی وہ بھی
ہوائے گُل اِدھر خلد آفریں ہے اور سستی ہے

نگاہِ شوق اُدھر جانے میں سو سو ناز کرتی ہی
اِدھر فطرت طوافِ روضۂ ممتاز کرتی ہی

وہاں مشکل سے ہوتا ہی میسر اک گُلِ تر بھی
یہاں جنت بھی ہی تسنیم بھی ہے اور کوثر بھی

وہاں صرف اک تہ خانہ ہی وہ بھی تار اور تیرہ
یہاں آئینہ بندی سے درخشاں ہی مُحجّر بھی

وہاں دن بھی ہجومِ یاس سے تاریک رہتا ہی
یہاں آتا ہے لینے روشنی ماہِ منوّر بھی

وہاں عبرت ہی عبرت ہی یہاں رحمت ہی رحمت ہی
وہاں معدوم مدفن تک، یہاں زندہ ہی منظر بھی

جہاں میں شہرتِ نورِ جہاں گو آج باقی ہے
مگر ممتاز کے سر پر ابھی تک "تاج" باقی ہے

چاند اور تاج

چاند:۔

اے عروسِ ہند، سیرِ شب کو جب آتا ہوں میں
محوِ نازش اپنے جلووں میں تجھے پاتا ہوں میں

میری دنیا سے کوئی تارا اگر اٹھا ٹوٹ کر
ہو گئیں ساحل پہ قائم اُس کی کرنیں پھوٹ کر

میری نظروں میں وہی افتادہ اک انجم ہے تو
کیوں غرورِ ناز و رفعت کی فضا میں گُم ہے تو؟

عالمِ پستی میں تیرا نام بالا مجھ سے ہے
روشنی تجھ سے نہیں ہے، یہ اجالا مجھ سے ہے

دور ہو جاتی ہے ساری تیرگیِ دل تری
جگمگا اُٹھتی ہے کرنوں سے مری محفل تری

چاندنی میری بڑھا دیتی ہے تیرے حسن کو
جلوہ پیرائی سکھا دیتی ہے تیرے حسن کو

ہے یہ تیرا مرمریں انبار، اک بارِ نظر
تربتِ ممتاز اور صاحبقراں کی قبر پر

تو ہے ہر سیاح کی نظروں میں ہمدرِ ماہتاب
اور وہ مدفن کی تاریکی میں صرفِ انقلاب

ڈھیر تیرا دونوں قبروں کے لئے ہی اک حجاب
گھیر لی ہے دستوں نے تیری اُن کی آب و تاب

سامنے اس پاک تہ خانے کے جب آتا ہوں میں
مرقدِ ممتاز پر اک نور پھیلاتا ہوں میں

محفلِ ہستی کے گل ہو جانے والے اے چراغ!
تو زمیں پر، اور ہے افلاک پر تیرا دماغ

جب کوئی بادِ فنا کا تند جھونکا آئے گا　　صورتِ ظلمات تجھ پر بھی اندھیرا چھائے گا
قرض لے کر مجھ سے، اپنے نور پر نازاں نہ ہو　　نقشِ خاکی ہے، مثالِ کہکشاں رخشاں نہ ہو

میری محفل، لازوال آئینۂ ایام ہے
اے نگارِ بزمِ فانی تو فنا انجام ہے

تاج :-

اے امیرِ کاروانِ شب سنا شکوہ ترا　　ہے غلط تنقید، مہمل طعنۂ بے جا ترا
سرد کرنوں میں چھپا کر زہر کے نشتر نہ پھینک　　آسماں والے زمیں پر رات کو پتھر نہ پھینک
مستیوں میں اپنے کیف و رنگ کی مدہوش ہوں　　اسلئے یہ لن ترانی ہے کہ میں خاموش ہوں؟
ذہن پر تیرے کدورت کا اندھیرا چھا گیا　　چار دن کی چاندنی پر اس قدر اترا گیا
ہو حقیقت سے جو تو واقف، تو یہ باتیں نہ ہوں　　آ کبھی اُس وقت بھی، جب چاندنی راتیں نہ ہوں
ظلمتِ شب میں بھی میری فطرتِ تنویر دیکھ　　ہر ورق پر پھول کے اک چاند کی تصویر دیکھ
تو اندھیری رات میں اکبار جب آیا نہیں　　آ گیا کیونکر تجھے اپنے خیالوں پر یقیں
میں تری دنیا کا اک افتادہ سیارہ نہیں　　دیکھ قائم اپنے مرکز پر ہوں آوارہ نہیں
میں امینِ راز ہوں، انجام اور آغاز کا　　سطوتِ صاحبقران و جلوۂ ممتاز کا
ہیں مری آغوش میں وہ آفتاب و ماہتاب　　تیری دنیا بھی نہ اب تک دے سکی جن کا جواب

یں اگر دامن اُٹھالوں اُن کی قبرِ پاک سے — آسماں تھرّا اُٹھے نظارۂ غمناک سے

کیوں ہوا حیران جو یہ حسرت کدا پردے میں ہے — اے چراغِ شام، خود تیرا خدا پردے میں ہے

روح کی شمعوں سے رخشندہ وہ خلوت خانہ ہے — ہر کرن تیری جہاں بھٹکا ہوا پروانہ ہے

وہ نہیں محتاج تیری چاندنی کے رات میں — رات دن تاباں ہے حسنِ ذات اُنکی ذات میں

طعنِ قرضِ نور کیوں دیتا ہے مجھ کو بار بار — کیا نہیں معلوم تو سورج کا خود ہے قرضدار؟

ایک حالت پہ ہوں میں مصروفِ تابش رات دن — اور تو ہے آسماں پر صرفِ کاہش رات دن

کیا کہا تو نے کہ فطرت کو نہیں تیری زوال! — بدر سے یہ کون بن جاتا ہے گھٹ گھٹ کر ہلال؟

صبح کے ہوتے ہی چہرہ کس کا ہو جاتا ہے فق؟ — کون رہ جاتا ہے بن کر دن کو تانبے کا ورق؟

میں شب و روز ایک ہی انداز سے ضوبار ہوں — اس جہاں کی مستقل اک دولتِ بیدار ہوں

طاق میں تہ کر کے رکھ احسان کی چادر نہ پھینک — ہو سکے تجھ سے تو اپنی چاندنی مجھ پر نہ پھینک

یکھ پھر کس طرح اپنا نور برساتا ہوں میں — دیکھ پھر کیوں کر مجسّم چاند بن جاتا ہوں میں

اں فنا انجام ہوں، اسکا مجھے اقرار ہے — لیکن اس میں بھی ہے میری جیت، تیری ہار ہے

تجھ کو اپنی عمر میں خوفِ فنا ہے بار بار — میری فطرت کو نمودِ حشر کا ہے انتظار

شر تک یہ میرا استحکام مٹ سکتا نہیں — میں تو مٹ سکتا ہوں میرا نام مٹ سکتا نہیں

ہوں خجل تجھ سی نہ تیری روشنی سی ماند ہوں — آسماں کا چاند تو ہے۔ میں زمیں کا چاند ہوں

تاج

(شبِ تاریک میں)

رات آئی پردۂ تاریک پھیلاتی ہوئی — جلوۂ شام و شفق کے ساتھ اتراتی ہوئی
حکمرانی ہو گئی ظلمت کی دشت و باغ پر — روشنی سمٹی ہر اک گوشے سے شرماتی ہوئی
ناگہاں مغرب سے اک خاموش تاریکی بڑھی — جگنوؤں کے روپ میں تارے سے چمکاتی ہوئی

جل اُٹھیں شمعیں کہ عالم میں اندھیرا ہو گیا
اور پروانوں کی دُنیا میں سویرا ہو گیا

اک اُداسی ہر جگہ ہر چیز پر طاری ہوئی — عالمِ اجسام میں مرنے کی تیاری ہوئی
خواب نے انگڑائیاں لیں، لی جماہی کسل نے — انجمن میں بے خودی کی گرم بازاری ہوئی
اک نقابِ جلوہ دشمن میں مناظر چھپ گئے — حسن کو بارِ تماشا سے سبکباری ہوئی

غرق اک سیالِ مستی میں زمانہ ہو گیا
ہو گیا غافل مصوّر، اور شاعر سو گیا

ہاں مگر اک تاج ہے اسوقت لعلِ شب چراغ — نور اسکا ہے نمایاں بجھ گئے ہیں سب چراغ
چاند سے گنبد کے پیدا ہے طلائی روشنی! — پھول کے معنی تجلی، غنچے کا مطلب چراغ
لاؤ تابانی میں اس کی، اس کا عالم دیکھ لیں — کون اب فانوس مانگے، کون ڈھونڈے اب چراغ

اس کے سائے میں گیاہِ سبز نخلِ طور ہے
زندگی اس کے اندھیرے میں بھی منظور ہے

شمع بن کر حوض میں اس کے شگفتہ ہیں کنول — چاندنی کا پھول ہے گویا شبِ مہ کا بدل
خلوتِ سبزہ میں ہیں جگنو چراغانِ بہار — نسترین و نسترن کا ہر روش پر ہے عمل
اس کا عکسِ مرمریں ماحول پر ہے نور بار — جب اُدھر دیکھا تو گویا آفتاب آیا نکل

ہر روش پر زندگی کے مرتسم عنوان ہیں
تاج تیری رات میں بھی صبح کے سامان ہیں

ج اک موتی ہے، موتی نور کا چھپتا نہیں — تاج اک تارا ہے، تارا خواب کا تشنہ نہیں
ات دن بیدار، پُرانوار، سرشارِ بہار — تاج ہے اک چاند، قسمت چاند کو سونا نہیں
، وہ تاریکِ شب غالب ہو اس پر کس طرح — تاج اک سورج ہے، اور سورج کبھی چھپتا نہیں

ہیں جو ظلمت جذب کر لینے کے جوہر تاج میں
نور بن جاتی ہے خود بھی رات آ کر تاج میں

تاج منہ سے بولتا ہے ساری دنیا ہے خموش
تاج اب تک ہے درخشاں "تاج والا" ہے خموش

رات کو "تاج" ہیں اور نغمۂ اسرار حسن
گلستانِ "تاج" کا گوپتہ پتہ ہے خموش

کوئی سن سکتا ہے سب کچھ اور کوئی کچھ بھی نہیں
ذرہ ذرہ نغمہ گر ہے، ذرہ ذرہ ہے خموش

ساری دنیا سو رہی ہے تاج پُر انوار ہے
مادیت خواب میں، روحانیت بیدار ہے

قصر الادب

تعالی اللہ! ارضِ تاج سرافرازیاں تیری
عروجِ اکبر و شاہ جہاں کے عہدِ رفعت میں

ترے گھر میں پڑی بنیاد اس ایوانِ عالی کی،
"ادب" کہتے ہیں جس کو اصطلاحِ علم و حکمت میں

تری ہی خاک سے پیدا ہوئے میر اور غالب بھی
ہیں تیرے ہی عناصر کار فرما میری خلقت میں

تراسی سال بعدِ میر ہے تخلیقِ غالب[۵۱] کی
یہی وقفہ ہے میری[۵۲] اور غالب کی ولادت میں

"ادب" کی ہر صدی میں فطرتاً تجدید ہوتی ہے
بدل جاتا ہے اسلوبِ کہن اک خاص مدت میں

تراوش میری ہستی کی ہوئی ہے ذہنِ فطرت سے
مرے بعد آئے گا اب کون؟ یہ ہے ذہنِ فطرت میں

"ادب" کو میرے انفاسِ جواں نے زندگی بخشی
نیا اک سوز پیدا ہو گیا سازِ قدامت میں

جہاں منزل پہ میر کارواں کے بعد پہونچے گا
امیرِ کارواں ہے کارواں میرا حقیقت میں

---

۵۱ ولادتِ میر در اکبرآباد ۱۱۲۵ھ ، ۵۲ ولادتِ غالب در اکبرآباد ۱۲۱۲ھ ، ۵۳ ولادتِ سیماب در اکبرآباد ۱۲۹۹ھ

شاہجہاں کی آخری ہچکی

خلوت کی برہم سامانیوں میں، مطلق اُداسی چھائی ہوئی ہے
پُرہول شب کی ویرانیوں میں، عبرت کی ساعت آئی ہوئی ہے
شاہِ جہاں ہے موجودِ بستر، یا ہے تخیّل شاہِ جہاں کا
کیا یہ وہی ہے سلطانِ کشور، جو حکمراں تھا ہندوستاں کا
شمعِ حرم کے آنسو ہیں جاری   ہے ایک لرزش قلعے پہ طاری
خلوت کی برہم سامانیوں میں، پُرہول شب کی ویرانیوں میں
مطلق اُداسی چھائی ہوئی ہے
عبرت کی ساعت آئی ہوئی ہے
شاہِ جہاں ہے بیزارِ دنیا، بالیں سے دنیا لپٹی ہوئی ہے
دل جبہ کوشِ ترکِ تمنا، دل سے تمنّا لپٹی ہوئی ہے
خیل و حشم کی، تاج و علم کی، دنیا ادب سے ہے پیشِ خدمت

وہ ہیم و افسر، اقلیم و عسکر، صدہا خزانے، معمورِ دولت

تاریخِ ماضی ہنگامہ در بر، پیشِ نظر ہے آئینہ بن کر

شاہِ جہاں ہے بیزارِ دنیا دل جبر کوشِ ترکِ تمنا

بالیں سے دنیا لپٹی ہوئی ہے

دل سے تمنا لپٹی ہوئی ہے

ہے "تاج" حدِ چشمِ تماشا، آمد کسی کی ہے آج اس میں

جنت بنی ہے نظروں کی دنیا، وہ "تاج" میں ہے اور "تاج" اس میں

آئی ہے لینے ممتاز بانو، زلفوں میں اس کی بوئے ارم ہے

آنکھوں سے جاری اشکِ محبت، لب پر تبسم، روانِ غم ہے

قیدِ فنا سے تحلیل ہو کر، نقشِ بقا میں تبدیل ہو کر

ہے تاج حدِ چشمِ تماشا، جنت بنی ہے نظروں کی دنیا

آمد کسی کی ہے آج اس میں

وہ "تاج" میں ہے اور "تاج" اس میں

اب حکمرانی، ہے اک کہانی، ہوتا ہے رخصت سلطانِ عالی

اے زندگانی، کر نوحہ خوانی، خالی پڑا ہے ایوانِ عالی

معمورۂ حشمت، مجبورِ رحلت، دارِ فنا سے ہے "تاج" والا
محتاج بھی ہے تاراج بھی ہے، یاقوت، لعل اور پکھراج والا
ہے اختتامِ صاحبقرانی   اَللہُ بَاقِیْ مِنْ کُلِّ فَانِیْ
اب حکمرانی ہے، اک کہانی، اے زندگانی کر نوحہ خوانی
ہوتا ہے رخصت سلطانِ عالی
خالی پڑا ہے ایوانِ عالی

(خورشید قمر)
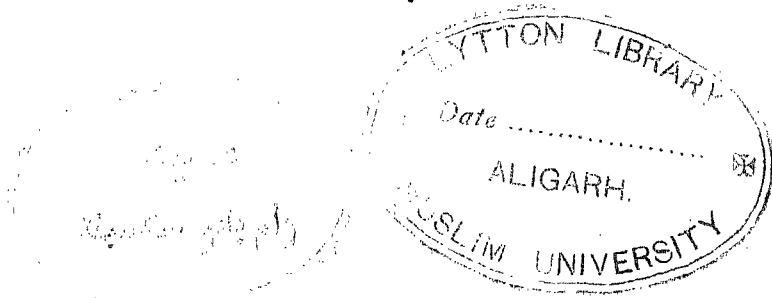
(زیرِ طبع)

خضرِ ادب

مولٰنا سیماب اکبرآبادی کا پہلا دیوانِ غزلیات

براہ راست روح کو چھیڑنے والے ہزاروں نشتر

۱۸۹۸ء سے ۱۹۳۳ء تک ۳۶ سال میں مولٰنا نے جتنی غزلیں کہی ہیں وہ سب اس مجموعے میں بعد انتخاب شائع کردی گئی ہیں۔ تغزّل کا اجتہادی رنگ، غزل کا صحیح و بلند معیار، اور مشرقی شاعری کا جدید ارتقا آپ صرف "خضرِ ادب" میں ملاحظہ فرما سکتے ہیں۔ مختلف موضوعات پر مولٰنا کی بہت سی رباعیاں بھی شریک اشاعت ہیں۔ ماہرین فنّ غزل کے دو مبسوط دیباچے اُردو شاعری کے دو بیش بہا خزانے ہیں۔ کتابت و طباعت کا بطور خاص انتظام کیا گیا ہے قیمت کا اعلان کچھ دن بعد کیا جائیگا لیکن آپ اپنا نام خریداروں کی فہرست میں ابھی سے لکھوا دیجیے تاکہ "دیوان" بعد تکمیل پہلے آپکی خدمت میں بھیجدیا جائے مولٰنا کے اس دیوان کا انتظار ملک میں سالہا سال سے ہے۔ اسلئے چھپتے ہی فروخت ہونیکا امکان ہے

ناظم قصر الادب، دفتر "شاعر" آگرہ

(سلسلۂ مطبوعات قصر الادب نمبر ۲)

مطبوعہ آگرہ اخبار پریس آگرہ

اشاعت گاہ

قصر الادب، آگرہ

قیمت مجلد للعہ غیر مجلد ۳/۸

(علاوہ محصول)